سلسلۂ درسِ حدیث (۱)

کتابُ الصَّوم

(مِشکوٰۃ المصابیح)

کے

عام فہم مطالب

از

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جمع و تدوین

حفیظ الرحمٰن احسن

البدر پبلی کیشنز
۲۳- راحت مارکیٹ
چوک اردو بازار لاہور

طبع اول	فروری 1973ء
سوم	جنوری 1995ء
قیمت	روپے
عکسی سرورق	ارشد کمال
کتابت	محمد شریف منظر
طباعت	مطبعۃ العربیہ پرنٹرز

البدر پبلیکیشنز

23- راحت مارکیٹ' اردو بازار' لاہور- فون 7225030

فہرستِ مضامین

کِتَابُ الصَّوْم

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ رُؤْيَةِ الْهِلَال

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

باب

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ تَنْزِيهِ الصَّوْمِ

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ صَومِ المُسَافِر

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ الْقَضَاء

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ صِيَامِ التَّطَوُّع

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

باب

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بَابُ الِاعۡتِکَاف

فصل اوّل

فصل ثانی

فصل ثالث

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْن

عرضِ مرتّب

اواخر ۱۹۶۷ء میں جب راقم الحروف نے ہفت روزہ "آئین" لاہور میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی مدّظلّہ العالی کے ہفتہ وار درسِ حدیث کو مرتب کر کے شائع کرنا شروع کیا تو اسے بے حد پسند کیا گیا۔ مولانائے محترم کے دینی سرمایۂ علم و حکمت سے قدرشناسوں نے اس کوشش کو اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کا وسیلہ سمجھا اور ان کی طرف سے پیہم مطالبہ شروع ہوا کہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ کتاب الصوم کی تکمیل پر راقم الحروف نے لکھا:

"آئین میں مولانائے محترم کے درس حدیث کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہونے پر قارئین اور رفقاء کی طرف سے یہ تجویز آتی رہتی ہے کہ موجودہ باب کی تکمیل پر اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ تشریح حدیث کا ایک قابلِ قدر مجموعہ دلدادگانِ بصائرِ نبویؐ کے ہاتھوں تک پہنچ سکے۔ خود راقم الحروف کی دلی خواہش بھی یہ رہی ہے کہ ایک ایسا مجموعہ مرتب کر کے مولانائے محترم کی خدمت میں پیش کیا جائے تاکہ ان کی اجازت اور نظرِ ثانی کے بعد اسے کتابی شکل میں شائع کیا جا سکے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تشنگانِ شوق کو اس مجموعے کے لیے ایک عرصے تک زحمت کشِ انتظار رہنا پڑے گا، کیونکہ:

اوّلاً یہ بات کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ درسِ حدیث کے یہ متن اپنی موجودہ شکل میں کسی مربوط علمی اور تحقیقی تصنیف کے قائم مقام متصوّر نہیں ہو سکتے اِلّا یہ کہ ان پر مفصّل نظرِ ثانی کی جائے اور تحقیقی محنت صرف کر کے انہیں تصنیفی معیار پر لایا جائے

(مولانائے موصوف کی رائے یہی ہے)'

ثانیاً یہ کہ مولانائے محترم تفہیم القرآن کی مصروفیت کی وجہ سے فی الحال کسی اور تصنیفی یا تحقیقی کام کی طرف توجہ نہیں دے سکتے۔ یہ امر واضح ہے کہ تفہیم القرآن کی تکمیل بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے اور اس کی تکمیل مولانائے محترم کو اور ہم سب کو عزیز ہے'

اس لیے فی الحال اس مبارک وقت کا انتظار ہی مستحسن ہے جب کہ مولانائے محترم اس کام کے لیے وقت نکال سکیں۔ اس دوران میں راقم الحروف کی کوشش یہ رہے گی کہ وہ مطبوعہ مواد کو ایک مرتب شکل میں محفوظ کرلے تاکہ جب اور جیسے اللہ کو منظور ہو' مولانا کی نظرثانی کے بعد اس کو شائع کیا جا سکے" (آئین، ۸ جولائی ۱۹۶۰ء)

اس کے بعد مسلسل ایسے حالات پیش آتے رہے کہ اس کام کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا غیر یقینی ہوتا چلا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو تفہیم القرآن کے کام کی طرف مولانائے محترم کی خصوصی توجہ تھی اور دوسری وجہ ملک کی طوفانی سیاسی زندگی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُن کی غیر معمولی مصروفیت تھی، اور صحت کی مسلسل خرابی اس پر مستزاد تھی۔ اس دوران میں ایک لمبا زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جس میں بیماری اور اس کے علاج کی وجہ سے مولانائے محترم کی ساری علمی اور سیاسی سرگرمیاں سرے سے معطل ہی رہیں ـــــ اس قسم کے حالات میں یہ کام مسلسل ملتوی رہا تاآنکہ جب گزشتہ سال (جولائی ۱۹۷۰ء میں) میں نے مذکورہ مرتب شدہ مجموعہ پر مولانائے محترم سے نظرثانی کی درخواست کی تو انھوں نے اپنی کمزوریٔ صحت کی بنا پر اس کام سے معذوری کا اظہار فرمایا، البتہ مجھے اس امر کی اجازت مرحمت فرمادی کہ میں اس پر ضروری محنت صرف کر کے دو باتوں کی تصریح کے ساتھ اسے شائع کر دوں:

اوّلاً یہ کہ اس کتاب میں شائع شدہ دروس حدیث کو اُن درسوں پر قیاس نہ

کیا جائے جو دینی مدارس میں حدیث کے طالب علموں کے سامنے دیے
جاتے ہیں، بلکہ یہ درس ہفتہ وار اجتماعات میں افادۂ عام کے لیے دیے گئے
ہیں اور ان میں مخاطبین کی ذہنی سطح اور ضرورت کو ملحوظ رکھ کر مطالبِ حدیث
کی وضاحت کی گئی ہے۔

ثانیاً یہ کہ اس کتاب کو مولانائے محترم کی اپنی تحریر کی حیثیت حاصل نہیں
ہے بلکہ مرتب نے تقریری مواد کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے تحریر کے
سانچے میں ڈھالا ہے۔

حق تو یہی تھا کہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کرنے اور اس کو تصنیفی معیار پر لانے کا کام
خود سیدِ محترم ہی کرتے یا کم از کم اس نازک ذمہ داری کا بوجھ کوئی ایسے صاحبِ علم اُٹھاتے
جو قرآن، حدیث کے وسیع علم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ کی باریکیوں سے بھی
آگاہ ہوتے تاکہ تشریحِ حدیث کا یہ قیمتی سرمایہ زیادہ سے زیادہ قابلِ اعتماد طریقے سے
مرتب و مدوّن ہوتا، لیکن اسے حالات کی نیرنگی کہیے کہ اس کٹھن فریضے کی ادائیگی کا
کام مجھ ایسے ہیچمدان کو کرنا پڑا جو نہ تو دینی علوم سے کوئی قابلِ ذکر شناسائی رکھتا ہے
اور نہ زبان و ادب ہی سے اسے کوئی بہرۂ وافر ملا ہے۔ ایک طرف اپنی علمی بے مائگی
کا یہ شدید احساس اس کام کی جانب پیش قدمی سے روکتا رہا اور دوسری طرف یہ جذبہ
بیتاب سمندِ شوق کے لیے مہمیز کا کام کرتا رہا کہ یہ عظیم سعادت اگر تمہارے حصہ میں آجائے
تو فلاحِ اُخروی کا ذریعہ بن سکتی ہے ____ سو اسی قسم کے احساسات کے درمیان
توفیقِ ایزدی کا سہارا لے کر مقدور بھر کچھ نہ کچھ کرتا رہا۔ چنانچہ یہ محض اُسی کا فضل و
احسان ہے کہ جو تھوڑی بہت محنت و کوشش مجھ سے بن پڑی ہے اس کا ثمر اس
کتاب کی شکل میں قارئین کرام کی نذر کر رہا ہوں، اور خدائے بزرگ و برتر کے حضور میں یہ
دعا کرتا ہوں کہ وہ میری اس کوشش کو شرفِ قبول سے نوازے اور اسے میرے

لیے اُخروی اور دُنیوی فلاح و سعادت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ خدائے عزوجل سے میری یہ بھی دُعا ہے کہ وہ حدیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم کے اس گلدستے کو اپنے بندوں کے لیے اُسی طرح ذریعۂ رُشد و ہدایت بنائے جس طرح اُس نے سیدِ محترم کے دوسرے دینی سرمایۂ علمی کو اس شرفِ خاص سے مشرف فرمایا ہے۔ توقع رکھنی چاہیئے کہ یہ کتاب مولانائے محترم کی اُن مساعئ جمیلہ کا ایک حصّہ قرار پائے گی جو انھوں نے اس دَور میں سُنّتِ نبوی عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوۃُ وَالتَّسْلِیْمُ کے دفاع و تحفظ، اس کی تشریح و توضیح، اس کے متعلق معاندین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کو رفع کرنے اور اس پر ملتِ اسلامیہ کے ایمان و اعتقاد کو محکم بنانے کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔ اِن شَاءَ اللہُ العزیز

میں اس موقع پر اہلِ علم حضرات سے یہ درخواست کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس کتاب میں کوئی علمی فروگزاشت پائیں تو اسے میری کوتاہئ علم پر محمول کریں اور مجھے اس سے آگاہ کر کے ممنون فرمائیں تاکہ کتاب کی آئندہ طبع کے موقع پر اس کی اصلاح و تلافی کی جا سکے۔

یہاں یہ وضاحت قارئین کے لیے دلچسپی اور افادے کی موجب ہو گی کہ پیشِ نظر کتاب حدیثِ نبوی کے مشہور و مقبول مجموعہ مِشْکٰوۃُ الْمَصَابِیْح میں سے کتابُ الصوم کی تشریح پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی واضح رہے کہ احادیث کے آغاز میں جو عنوان لکھے گئے ہیں وہ مشکوٰۃ کے متن کا حصّہ نہیں ہیں بلکہ مرتب نے احادیث کے بعض اہم مضامین کی مناسبت سے خود قائم کیے ہیں۔

مَیں آخر میں اپنے رفیقِ محترم جناب منظفر بیگ صاحب مدیر "آئین" کے اس گرانقدر تعاون کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے اپنے مؤقر جریدے میں اِن دُروسِ حدیث کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان درسوں کی ترتیب و اشاعت کے حقیقی محرک وہی ہیں اور اگر وہ مجھے اس خدمت کی طرف متوجہ نہ کرتے تو میں شاید ایک عرصے تک اس کام کو کرنے کا ارادہ نہ کر سکتا۔ فَجَزَاهُ اللہُ فِی الدَّارَیْنِ خَیْرًا۔

احقر
حفیظ الرحمٰن احسن

لاہور، ۲۷ رجب المرجب ۱۳۹۲ھ (۷ ستمبر ۱۹۷۲ء)

مِشْكٰوةُ الْمَصَابِيْح

پیشِ نظر کتاب حدیث نبویؐ کے مشہور و مقبول مجموعہ مِشْكٰوةُ الْمَصَابِيْح کے ایک جز و کتابُ الصَّوْم کی تشریح پر مشتمل ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشکوٰۃ کا مختصر سا تعارف کرا دیا جائے۔

مِشْكٰوةُ الْمَصَابِيْح آٹھویں صدی ہجری کے ایک متبحر عالم و فقیہ اور جلیل القدر محدث ولی الدین محمد بن عبد اللہ تبریزیؒ[1] کی نادر تالیف ہے۔ اس کی بنیاد مشہور محدث، مفسر اور فقیہ امام بغویؒ[2] کے مرتب کردہ مجموعۂ حدیث "مَصَابِيْحُ السُّنَّة" پر رکھی گئی ہے، جس کی تہذیب و اصلاح کر کے مزید احادیث کے اضافے سے نیا مجموعہ مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے ترتیب دیا گیا۔

مشکوٰۃ المصابیح اور اس کے مؤلف علامہ تبریزیؒ کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنے جلیل القدر استاد علامہ حسین بن عبد اللہ الطیبیؒ[3] کے مشورے اور ایماء پر مرتب کی، اور جب یہ مرتب ہو چکی تو ان کے استاذِ محترم نے خود اس کی ایک جامع شرح "اَلْكَاشِفُ عَنْ حَقَائِقِ السُّنَنِ" کے نام سے تحریر کی۔

مِشْكٰوةُ الْمَصَابِيْح کی اہمیت اور خصوصیات کو جاننے کے لیے ضروری

---

[1] افسوس ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت و وفات کی تحقیق نہیں ہو سکی۔ تاہم یہ معلوم ہے کہ وہ مشکوٰۃ کی تالیف سے ۷۳۷ھ میں فارغ ہوئے۔

[2] محی السنۃ ابو محمد الحسین بن مسعود الفراء البغویؒ، وفات ۵۱۶ھ [3] وفات ۷۴۳ھ

ہے کہ امام بغویؒ کی مَصَابِیحُ السُّنَّة کی خصوصیات پر ایک نظر ڈال لی جائے ،

۱۔ مصابیح السنّة میں احادیث کو فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کیا گیا تھا اور ہر باب میں دو فصلیں قائم کی گئی تھیں ۔ ایک فصل میں صرف امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کی روایت کردہ احادیث جمع کی گئی تھیں اور دوسری فصل میں ابوداؤدؒ ، ترمذیؒ ، نسائیؒ ، ابن ماجہؒ ، بیہقیؒ اور دارقطنیؒ وغیرہم کی روایات کو جگہ دی گئی تھی ۔

۲۔ صاحبِ مصابیح نے احادیث کو اُن کے راویوں اور متعلقہ کتبِ احادیث کے حوالے کے بغیر جمع کیا تھا۔ اس سے طالبانِ حدیث کو ان احادیث کے مَصادر و مآخذ کا پتہ لگانے ، اور باعتبارِ سَنَد اُن کی صحت اور مقام و مرتبہ کے تعین میں مشکل پیش آتی تھی ۔

مصابیح السُّنّہ کے مقابلے میں مشکوٰۃ المصابیح میں :

۱۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے مصابیح السُّنّہ کی پہلی دو فصلوں پر ایک تیسری فصل کا اضافہ بھی کیا ہے ، اور احادیث کا انتخاب کرتے ہوئے صحاحِ ستّہ (بخاری ، مسلم ، نسائی ، ابوداؤد ، ترمذی ، ابن ماجہ) کے علاوہ "شُعَبُ الإیمان" للبَیْہَقِی ، مُسند امام احمدؒ اور مُسند رَزِین ؒ وغیرہا کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے ۔ اس طرح موضوع کی مناسبت سے بہت سی مزید اہم احادیث اس مجموعہ میں آگئی ہیں ۔ مصابیح میں احادیث کی تعداد ۴۴۳۴ تھی جبکہ مشکوٰۃ میں یہ تعداد ۵۹۴۵ ہوگئی ۔

چونکہ مشکوٰۃ المصابیح تمام مستند کتبِ احادیث کا ایک مختصر لیکن جامع اور وَقیع انتخاب ہے اس لیے اس کو طلبہ حدیث ، علماء اور عام مسلمانوں میں جو قبولِ عام حاصل ہوا وہ اس نوع کی کم ہی کتابوں کو نصیب ہوا ہے ۔ یہ کتاب مختلف فقہی مکاتبِ فکر میں یکساں مقبول و مروّج ہے اور دینی درسگاہوں میں عام طور پر سبقًا سبقًا پڑھائی جاتی ہے ۔ اس کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اُن شروح

سے بھی لگایا جاسکتا ہے جواب تک عربی، اُردو اور بعض دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ کتبِ حدیث میں صحیحین کے بعد یہ اعزاز اسی کتاب کو حاصل ہوا ہے۔

عربی شرحوں میں علامہ الطیبیؒ کی شرح (جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے)، مِرْقَاةُ الْمَفَاتِیْح (ملا علی قاریؒ)، لَمْعَات (شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ)، اَلتَّعْلِیْقُ الصَّبِیْح (مولانا محمد ادریس کاندھلوی) اور مِنْهَاجُ الْمِشْکٰوة (عبدالعزیز الابہریؒ) اہم ہیں۔ فارسی میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی شرح اَشِعَّةُ اللَّمْعَات معروف ہے۔ اُردو میں مولانا عبدالغفور غزنویؒ کا ترجمہ و حواشی (جو آج کل نایاب ہے) اور مولانا قطب الدینؒ کی مظاہر حق قابل ذکر ہیں۔ ایک انگریزی ترجمہ بھی ۱۸۰۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

مشکوٰۃ المصابیح کے مختلف اجزاء پاکستان کے مختلف تعلیمی نصابوں میں شامل ہیں ——— کِتَابُ الصَّوْم پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے اسلامیات کے نصاب کا ایک حصہ ہے۔

(مرتب)

ابتدائیہ

رمضان المبارک

—— تقویٰ، عبودیت اور شکرگزاری کا الٰہی نصاب

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرہ : ۱۸۳)

اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کر دیئے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔

۱۔ رمضان کے روزے ہجرت کے اٹھارہ مہینے بعد فرض ہوئے۔ تحویلِ قبلہ کا حکم اس سے کوئی ڈیڑھ دو ماہ پہلے آیا تھا۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت قرآن مجید، احادیث اور اجماعِ اُمت تینوں سے ثابت ہے۔ محولہ بالا آیت میں رمضان کے روزوں سے متعلق حکم دیتے ہوئے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور کُتِبَ کا لفظ فرضیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں قرآن مجید سے ثابت ہے کہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ یعنی اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے:

(۱) اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

(۲) نماز قائم کرنا۔

(۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔

(۴) بیت اللہ کا حج کرنا اور

(۵) رمضان کے روزے رکھنا ــــ

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ روزہ فرض ہی نہیں ہے بلکہ رُکنِ اسلام ہے۔

۲۔ "اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں مسلمانوں کو صرف ہر مہینے تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی، مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر سنہ ۲ ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا، مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں، وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بڈھے لوگوں کے لیے، جن میں روزے کی طاقت نہ ہو، اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔" [۱]

۳۔ سورہ بقرہ ہی میں آگے چل کر روزوں کا ایک مقصد یہ بیان ہوا ہے:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور جس ہدایت سے اللہ نے تمھیں سرفراز فرمایا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکر گزار بنو۔

---

[۱] تفہیم القرآن جلد اوّل صــ ۱۴۱

معلوم ہوا کہ رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور صرف تقویٰ کی تربیت ہی قرار نہیں دیا گیا ہے، بلکہ انہیں مزید برآں اُس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی ٹھہرایا گیا ہے، جو قرآن کی شکل میں اُس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکر گزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے، تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرے، جس کے لیے عطا کرنے والے نے یہ نعمت عطا کی ہو۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا فرمایا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے مہینے میں ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے، اور صرف اخلاقی تربیت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ خود اس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکر گزاری ہے۔"[1]

---

[1] تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۴۳

سکتہ کے مریض کا آخری امتحان اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس کی
ناک کے پاس آئینہ رکھتے ہیں۔ اگر آئینہ پر کچھ دھندلاہٹ پیدا
ہو تو سمجھتے ہیں کہ ابھی جان باقی ہے، ورنہ اس کی زندگی کی
آخری اُمید بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح مسلمانوں کی کسی
بستی کا تمہیں امتحان لینا ہو تو اسے رمضان کے مہینے میں
دیکھو۔ اگر اس مہینے میں اس کے اندر کچھ تقویٰ، کچھ خوفِ خُدا،
کچھ نیکی کے اُبھار کا جذبہ نظر آئے تو سمجھو ابھی زندہ ہے۔ اور
اگر اس مہینے میں نیکی کا بازار سرد ہو، فسق و فجور کے آثار
نمایاں ہوں، اور اسلامی حس مُردہ نظر آئے، تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ
رَاجِعُوْنَ پڑھ لو۔ اس کے بعد زندگی کا کوئی سانس مُسلمان
کے لیے مُقدّر نہیں ہے۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کِتَابُ الصَّوْم

اَلْفَصْلُ الاَوَّلُ

رمضان — نیکیوں کا موسم بہار

۱۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَفِیْ رِوَایَۃٍ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں" (ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں) اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں"۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں [۱] (متفق علیہ[۲])

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ رمضان کے آغاز میں لوگوں کو نصیحت کرنے کے لیے خطبات دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی خطبات میں سے ایک یہ خطبہ ہے —

---

[۱] معلوم ہوتا ہے کہ ان خطبات میں کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَبْوَابُ السَّمَآءِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کبھی اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ کے اور کبھی اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ کے، اور مدعا ان سب کا ایک ہے۔

[۲] متفق علیہ سے مراد وہ حدیث ہوتی ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہو۔

اس ارشادِ نبوی کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ یہاں مخاطب وہ مسلمان ہیں جن سے زیادہ سچے اور پکے مومن انسانی تاریخ میں نہیں دیکھے گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایات فرمائی ہیں عام طور پر اپنے خطباتِ جمعہ میں ارشاد فرمائی ہیں، اور جمعہ کی نماز کے وقت جو لوگ مسجدِ نبوی میں جمع ہوتے تھے ان کے بارے میں یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی کمزور ایمان کے یا اتباعِ اوامر میں کوتاہیاں کرنے والے مسلمان ہوں گے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ ان ہدایات کے مخاطب وہ سچے اہلِ ایمان ہیں جو نہایت صالح اور متقی تھے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کر زندگی بسر کرنے والے اور اس کی ہدایات کی پیروی کرنے والے تھے۔ اُن سے یہ فرمایا گیا ہے کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو آسمان (یا جنّت یا رحمت) کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں: اس کا مدعا مخاطبین کو یہ سمجھانا ہے کہ رمضان کی آمد کے بعد جتنی نیکیاں کر سکتے ہو کرتے چلے جاؤ، جنّت کے سب دروازے تمہارے لیے کُھلے ہیں۔ اگر صدقہ خیرات کے دروازے سے جنّت میں پہنچ سکتے ہو تو صدقہ و خیرات کے دروازے سے پہنچو۔ اگر روزے کے دروازے سے پہنچ سکتے ہو تو روزے کے دروازے سے پہنچو۔ اگر تلاوتِ قرآن کے راستے سے پہنچ سکتے ہو تو اس راستے سے پہنچو۔ اگر برائیوں سے اجتناب کے ذریعے سے پہنچ سکتے ہو تو اس ذریعے سے پہنچو۔ الغرض جنّت میں پہنچنے کے لیے تمام دروازے پوری طرح تمہارے لیے کُھلے ہیں۔ اور اب یہ تمہارا کام ہے کہ خود کو جنّت کے قابل بنا لو۔

پھر فرمایا کہ "جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے زمانے میں اُن برائیوں کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں جن میں ایک آدمی دوسرے زمانے میں عام طور پر مبتلا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایک نیکوکار مسلمان رمضان کی ایمان پرور فضا کی بدولت برائی کے بہت سے امکانات سے بچ جاتا ہے اور اس طرح جہنم کے دروازے اس کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

● تیسری بات یہ فرمائی کہ "شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں"
اِن الفاظ کا مدعا یہ ہے کہ رمضان المبارک وہ زمانہ ہے جس میں نیکیاں فروغ پاتی ہیں اور شیاطین کی کارفرمائی رُک جاتی ہے۔ چونکہ تمام مسلمان بیک وقت روزہ رکھتے ہیں اور ایک ایک آدمی الگ الگ روزہ نہیں رکھتا اس لیے بیک وقت روزہ رکھنے سے پوری قوم کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف رُجوع کا ایک ایسا ماحول پیدا ہو جاتا ہے جو دوسرے دنوں میں نہیں ہوتا۔ اس لیے رمضان وہ مہینہ ہے جس میں آدمی کے اندر رُجوع اِلیٰ اللہ کی ایک مسلسل کیفیّت جاری و ساری رہتی ہے کیونکہ جو آدمی بارہ چودہ گھنٹے روزے سے ہوتا ہے اسے گویا ہر وقت یہ یاد ہوتا ہے کہ میں روزے سے ہوں اور میں نے اپنے رب کی خوشنودی کے لیے روزہ رکھا ہوا ہے۔ جب اسے پیاس لگے گی تو وہ پانی نہیں پیئے گا کیونکہ اسے یاد ہوگا کہ وہ روزے سے ہے۔ جب اسے بھوک لگے گی اور کھانے کی خواہش ہو گی تو اسے یاد ہوگا کہ وہ روزے سے ہے اس لیے کھانے سے مجتنب رہے گا۔ اس طرح رمضان کے پورے مہینے میں آدمی کا رجوع مسلسل اللہ تعالیٰ کی طرف رہتا ہے ——— وہ افطار کرتا ہے تو گویا خود محسوس کرتا ہے کہ یہاں تک تو میرے رب نے مجھے باندھ رکھا تھا، اب اس نے مجھے اجازت دے دی ہے تو روزہ افطار کر رہا ہوں۔ اس کے بعد کھانا کھایا تو پھر تراویح کے لیے چلا گیا، جس سے پھر رُجوع الی اللہ کی نوبت آئی۔ اس طرح مسلسل چوبیس گھنٹے اللہ کی طرف اس کا رُجوع رہا ——— اور پھر یہ رُجوع ایک آدمی کا نہیں ہوتا بلکہ پوری قوم کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ رمضان نیکی کا موسم ہے۔
جس طرح بارش کا ایک موسم ہوتا ہے اور اس میں ہر چیز نشوونما پاتی ہے اسی طرح یہ نیکیوں کا موسم ہے اور اس میں نیکیوں کی ترقی کے بے شمار مواقع پیدا ہو جاتے ہیں۔ آدمی جس قدر رُوحانی ترقی کرنا چاہے کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ہر آدمی کی نیکی

دوسرے کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہر آدمی دوسرے کے روزے میں مددگار ہوتا ہے۔ عام دنوں میں روزہ رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی مشقت پائی جاتی ہے کیونکہ کوئی آدمی بھی روزے میں دوسرے کا مددگار نہیں ہوتا۔ لیکن رمضان میں یہ کیفیت نہیں ہوتی کیونکہ پورا معاشرہ ایک حالت میں ہوتا ہے۔ اس طرح ایک آدمی کو لاکھوں آدمیوں کے روزے سے مدد پہنچتی ہے اور ان کے تقویٰ اور نیکوکاری سے تقویت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رمضان میں انسان کی روحانی ترقی اور سیرت و کردار کی اصلاح و تعمیر کے بے شمار مواقع پیدا ہو جاتے ہیں ــــ آپ دیکھتے ہیں کہ اب بھی اس بگڑے ہوئے ماحول میں اگر کوئی شخص رمضان کے زمانے میں گالم گلوچ کر رہا ہو تو لوگ کہتے ہیں "میاں رمضان میں یہ حرکت کر رہے ہو؟" اس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے کو اب تک اس بات کا احساس ہے کہ رمضان کا احترام کیا معنی رکھتا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صدرِ اوّل میں کیا کچھ کیفیت ہو گی۔

اسی بنا پر فرمایا کہ رمضان میں جنّت کے دروازے کھل جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں ــــ لیکن یہ امر بہرحال ملحوظ رہنا چاہیئے کہ یہ بات ایک مسلم معاشرے کے صالح ماحول کے بارے میں بیان کی گئی ہے۔ ورنہ اسی زمانے میں اگر کوئی شخص شرک اور دوسرے گناہوں کا مرتکب ہو تو اس کے لیے دوزخ کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں اور جنّت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

جنّت کا ایک دروازہ روزہ داروں کے لیے مخصوص ہو گا

۲۔ عَنْ سَہْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ: فِي الْجَنَّةِ ثَمَانِيَةُ أَبْوَابٍ مِنْهَا بَابٌ يُسَمَّى الرَّيَّانُ لَا يَدْخُلُهُ إِلَّا الصَّائِمُونَ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کے آٹھ دروازے ہیں جن میں سے ایک دروازے کو "رَیّان" کہتے ہیں۔ اس دروازے سے (جنت میں) صرف روزہ رکھنے والے ہی داخل ہوں گے۔ (متفق علیہ)

رَیّان کا لفظ رِیّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں سیراب کرنا، آبپاشی کرنا۔ رَیّان سے مراد وہ دروازہ ہے جو سیراب کرنے والا ہے۔

جنت کے دروازوں سے مراد وہ بڑی نمایاں نیکیاں ہیں جن کے ذریعے سے آدمی جنت میں جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی فیاضی، سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھا ہوا ہے۔ وہ نیکی کے دوسرے کام بھی کر رہا ہے، روزے بھی رکھتا ہے اور نمازیں بھی پڑھتا ہے لیکن اس کی نمایاں نیکی جس کی وجہ سے وہ ممتاز ہے انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ چنانچہ یہ انفاق فی سبیل اللہ دراصل جنت کا ایک دروازہ ہے جس کے ذریعے سے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر مثلاً ایک اور شخص ایسا ہے کہ اس کے اعمال میں نمایاں نیکی جہاد فی سبیل اللہ ہے، تو وہ مجاہدین فی سبیل اللہ کے دروازے سے جنت میں داخل ہوگا۔ اس طرح مختلف آدمیوں کے جو نمایاں اوصاف ہیں ان کے لحاظ سے ان کی حیثیت مشخص ہوتی ہے اور انہی کے لحاظ سے جنت کے وہ دروازے ہیں جن سے وہ اس میں داخل ہوں گے۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ نیکیاں تو دنیا میں بے شمار ہیں لیکن اگر ان نیکیوں کو تقسیم کریں تو وہ آٹھ بابوں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ ان آٹھ بابوں میں سے جس باب سے کوئی شخص زیادہ مناسبت رکھتا ہوگا اسی کے راستے سے وہ جنت میں داخل ہوگا۔

یہ جو فرمایا کہ ان میں سے ایک دروازہ ریّان (یعنی سیراب کرنے والا) ہے اور اس سے جنت میں صرف روزہ دار ہی داخل ہوں گے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ویسے تو روزہ سارے مسلمان رکھیں گے لیکن جن لوگوں نے کثرت سے روزے رکھے، ان کا پورا پورا حق ادا کیا اور یہی بات پیش نظر رکھی کہ وہ روزے رکھ کر اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ دروازہ ان کے لیے مخصوص ہوگا۔

تمام گزشتہ گناہوں کی بخشش کا زمانہ

۳- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ - (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور احتساب کے ساتھ، تو اس کے وہ سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہوں گے۔ اور جس شخص نے رمضان میں قیام کیا (یعنی راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی) ایمان اور احتساب کے ساتھ، تو معاف کر دیئے جائیں گے اس کے وہ قصور جو اس نے پہلے کئے ہوں گے۔ اور جس شخص نے لیلۃ القدر میں قیام کیا، ایمان اور احتساب کے ساتھ تو معاف کر دیئے جائیں گے اس کے وہ سب گناہ جو اس نے پہلے کیے ہوں گے۔ (متفق علیہ)

اِحتِساب اس چیز کا نام ہے کہ آدمی اپنے تمام نیک اعمال پر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اجر کا اُمیدوار ہو اور خالصتہً اُسی کی رضاجوئی کے لیے کام کرے۔

اِس حدیث میں گناہوں سے معافی کی جو خوشخبری سُنائی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے اور آخرت کی بازپرس سے بے خوف ہیں ان کو اس بات کا لائسنس دیا جا رہا ہے کہ میاں رمضان کے روزے رکھ لو، تراویح پڑھ لو اور لیلۃ القدر میں کھڑے ہو کر عبادت کر لو، تو پچھلا حساب صاف اور آگے پھر گیارہ مہینے تمھیں جو کچھ کرنا ہے کرتے رہو۔ رشوتیں کھاؤ، لوگوں کے حق مارو، جو ظلم و ستم چاہو کرو، رمضان میں آ کے پھر عبادت کے لیے کھڑے ہو جانا، روزے رکھ لینا اور نمازیں پڑھ لینا اور پھر پہلے کا کیا ہوا سب معاف ہو جائے گا۔

اِس طرح کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، ان کے مخاطب وہ صلحاء و ابرار ہیں جو اپنی زندگیاں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن سے اگر کوئی لغزش یا گناہ سرزد ہو جاتا تھا تو اس کی نوعیت ایسی ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ جیسے ایک آدمی پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرے اور پھر اس پر ڈٹا رہے، بلکہ وہاں صورت اس سے یکسر مختلف تھی۔ ان راستباز لوگوں سے اگر کوئی قصور سرزد ہو بھی جاتا تھا تو وہ بشری کمزوری کی وجہ سے ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اس پر توبہ کے لیے مستعد رہتے تھے۔ بشری کمزوری سے اگر کسی سے کوئی قصور سرزد ہو جائے اور وہ اس کے بعد نیکی اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کو اپنا شعار بنائے رکھے تو وہ بجائے خود ایک توبہ ہے ——— توبہ کی ایک

صورت تو یہ ہے کہ ایک آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس نے اس سے توبہ کر لی تو یہ بات بھی گناہ کی معافی کا ایک ذریعہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی سے قصور سرزد ہوا اور پھر وہ دوسرے کاموں میں ایسا مشغول ہوا کہ توبہ کرنا بھول گیا تو اس کے بعد اُس نے جو نماز پڑھی وہ نماز اس کے لیے پہلے کی لغزش کو اُس کے حساب سے صاف کردے گی۔ اسی طرح اگر اس نے روزہ رکھا تو وہ بھی اس کے گناہ کو صاف کردیگا ــــ دراصل توبہ اسی چیز کا نام تو ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ایک قصور کا مرتکب ہوا تھا لیکن اس کے بعد وہ پھر اپنے رب کی طرف پلٹ آیا۔ جیسے ایک نوکر اگر اپنی کسی غلطی کی وجہ سے اپنے مالک کی اطاعت سے نکل جائے لیکن پھر معافی مانگ لے اور خدمت پر حاضر ہو جائے تو اس سے ایک دفعہ قصور سرزد ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مالک اُسے ہمیشہ کے لیے اپنی نوکری سے نکال دیگا بلکہ جس وقت وہ آکر معافی مانگتا ہے اور پہلے کی طرح خدمت کرنے لگتا ہے تو مالک اس سے درگزر کرے گا اور اس کی گزشتہ وفاداری کی وجہ سے اس پر پہلے کی طرح مہربان ہو جائے گا۔

ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ بندہ اگر بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کا وفادار ہے اور جان بوجھ کر اس کے مقابلے میں استکبار اور سرکشی کرنے والا نہیں ہے تو اگر اس سے کسی وقت کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے اور اس قصور کے بعد وہ پھر خدا کے دربار میں نماز کے لیے حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مغفرت سے محروم نہیں رکھے گا کیونکہ اس کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ وہ ٹھوکر تو کھا گیا تھا لیکن اپنے رب سے بھاگا نہیں تھا، اس کا باغی نہیں ہو گیا تھا ــــ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اگر ایک شخص نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے تو اس کے پچھلے قصور معاف ہو گئے۔ رمضان میں راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی تو وہ بھی پچھلے قصوروں کی معافی

کا ذریعہ بن گئی۔ اسی طرح اگر وہ لیلۃ القدر میں عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو اس کا یہ عمل بھی اس کے پچھلے قصوروں کی معافی کا سبب بن گیا۔

روزے کے اجر کی کوئی حد نہیں

۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ، يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَائِمٌ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے کئی گنا بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک نیکی دس گنی تک اور دس گنی سے سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزے کا معاملہ اس سے جُدا ہے کیونکہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا ــــــ روزہ دار اپنی شہواتِ نفس اور اپنے کھانے پینے کو میرے لیے چھوڑتا ہے ــــــ روزہ دار کے لیے دو فرحتیں

ہیں۔ ایک فرحت افطار کے وقت کی اور دوسری فرحت اپنے رب سے ملاقات کے وقت کی ـــــ اور روزہ دار کے منہ کی بساند اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے ـــــ اور روزے ڈھال ہیں، پس جب کوئی شخص تم میں سے روزے سے ہو تو اُسے چاہیئے کہ نہ اس میں بدکلامی کرے اور نہ دنگا فساد کرے ـــــ اگر کوئی شخص اس سے گالی گلوچ کرے یا لڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں۔" (متفق علیہ)

یہ جو فرمایا کہ دوسری نیکیاں تو دس گنی سے لے کر سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہیں لیکن روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں اُس کی جزا دوں گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری نیکیاں اللہ کے لیے نہیں ہیں اور اللہ ان کی جزا نہیں دے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق روزہ اس کے لیے خاص ہے اور وہ اس کی جتنی چاہے گا جزا دے گا۔ جب یہ فرمایا کہ دوسری نیکیاں سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہیں اور اس کے مقابلے میں استثناء کے ساتھ روزے کے متعلق فرمایا کہ میں ہی اس کی جزا دوں گا تو اس سے مراد یہ ہے کہ روزے کے اَجر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جس قدر چاہے گا روزہ دار کو اس کا اَجر دے گا۔

روزے کی یہ غیر معمولی فضیلت کیوں؟

بات دراصل یہ ہے کہ دوسری تمام نیکیاں آدمی کسی نہ کسی ظاہری فعل سے انجام دیتا ہے۔ مثلاً نماز ایک ظاہری فعل ہے۔ نماز پڑھنے والا نماز میں اُٹھتا اور بیٹھتا ہے، رکوع اور سجدہ کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایک نظر آنے والی عبادت ہے۔

ـــــــ اسی طرح حج اور زکوٰۃ کا معاملہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس روزہ کسی ظاہری فعل سے ادا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا مخفی فعل ہے جو فقط آدمی اور اس کے خدا کے درمیان ہوتا ہے ـــــــ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ روزہ دراصل اللہ کے حکم کی تعمیل کی ایک منفی شکل ہے۔ مثلاً نہ کھانا اور نہ پینا اور اسی طرح جن دوسری چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا۔ اس منفی فعل کو یا تو آدمی خود جان سکتا ہے یا اس کا رب، کسی تیسرے کو معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ منفی فعل اس نے کیا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر ایک آدمی چھپ کر کھا پی لے تو کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ روزہ نہ رکھتے ہوئے بھی کہہ سکتا ہے کہ میں روزے سے ہوں اور کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتا کہ آیا وہ روزے سے ہے یا نہیں۔ اگر وہ روزے سے ہے تو اس بات کو صرف وہ جانتا ہے اور اگر روزے سے نہیں تو اس کو بھی اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی وجہ سے روزے کا معاملہ صرف خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہوتا ہے اور اسی بنا پر اس میں ریا کا امکان نہیں ہوتا ـــــــ ایک آدمی دنیا کو دکھانے کے لیے بیشک یہ کہتا پھرے کہ میں روزے سے ہوں لیکن حقیقتِ صوم کے اندر اس ریاکاری کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ وہ خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ روزہ خاص میرے ہی لیے ہے، وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ میں ہی اس کی جزا دوں گا۔

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روزے کی بے حد وحساب جزا دے گا۔ جتنے گہرے جذبے اور اخلاص کے ساتھ آپ روزہ رکھیں گے، اللہ تعالیٰ کا جتنا تقویٰ اختیار کریں گے، روزے سے جتنے کچھ روحانی و دینی فوائد حاصل کریں گے اور پھر بعد کے دنوں میں بھی ان فوائد کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں

اس کی جزا بڑھتی چلی جائے گی ———

اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے کی اس غیر معمولی فضیلت اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ دار اپنی شہواتِ نفس اور کھانے پینے کو صرف اللہ ہی کی خاطر چھوڑتا ہے' اس لیے وہ بھی اسے آخرت میں بے حد و حساب اجر سے نوازے گا۔

روزہ دار کے لیے دو فرحتیں

● فرمایا کہ روزہ رکھنے والے کے لیے دو فرحتیں ہیں۔ ایک فرحت افطار کے وقت کی' اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت کی۔

مراد یہ ہے کہ جو فرحت ایک روزہ دار کو افطار کے وقت ملتی ہے وہ افطار پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے زیادہ فرحت اسے اُس وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے رب سے ملے گا اور وہاں اس کو معلوم ہو گا کہ جو عمل وہ دنیا میں کر کے آیا ہے اس کی یہاں کتنی بڑی جزا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے کس قدر قُرب سے نوازا ہے اور اس کی کتنی خوشنودی اسے حاصل ہوئی ہے۔

● فرمایا" روزہ دار کے منہ کی بساند اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے" کوئی شخص اپنے منہ کو چاہے کتنا ہی صاف رکھنے والا اور دانتوں کی صفائی کرنے والا ہو لیکن کئی کئی گھنٹوں تک کھانے پینے سے رُکے رہنے کی وجہ سے اس کے منہ میں ایک خاص قسم کی بساند پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کسی روزہ دار کے منہ میں اس طرح کی بساند محسوس ہو تو اس سے نفرت نہ کرنی چاہیئے کیونکہ یہ بساند اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔

روزہ ——— برائیوں کے مقابلے میں آدمی کی ڈھال

● فرمایا کہ روزے ڈھال ہیں' پس جب کوئی شخص تم میں سے روزے سے ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ اس میں بدکلامی کرے' نہ دنگا فساد۔

روزہ کے ڈھال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ کارزارِ حیات میں انسان کو برائیوں سے بچانے والی ڈھال ہے۔ جس طرح دشمن کا وار ڈھال پر روکا جاتا ہے اُسی طرح بُرائی کا کوئی موقع پیدا ہونے پر اگر ایک شخص یہ خیال کرے کہ وہ روزے سے ہے اس بُرائی سے بچ جاتا ہے تو اس کا روزہ اس کے لیے بُرائی کے مقابلے میں ڈھال کے بمنزلہ ہے۔

اِس ڈھال کی مدد کرنے اور اس کو مضبوط بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود بدکلامی نہ کرے، خود کسی کو بُرا نہ کہے اور خود کسی سے نہ لڑے۔ یہ ڈھال کی پہلی مدد ہے۔ اس کی دوسری مدد یہ ہے کہ کوئی دوسرا شخص لڑنے کو آئے تو اس سے کہے کہ بابا میں تو روزے سے ہوں۔ اگر تم گالی دوگے تو میں نہیں دوں گا۔ اس کے بعد یہ ڈھال اِس قدر مضبوط ہو جاتی ہے کہ آدمی کو ہر بُرائی سے بچا سکتی ہے۔

اگر ایک آدمی نے لوگوں سے خود جھگڑا کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنی اس ڈھال میں خود شگاف پیدا کر لیا جو اس کو بُرائی سے بچانے والی تھی۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس سے لڑنے کو آیا اور یہ بھی آستینیں چڑھا کر کھڑا ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے وہ ڈھال خود توڑ تاڑ کر پھینک دی۔ اب ایک وار وہ کرے گا اور دوسرا وار یہ کرے گا۔ لیکن اگر ایک آدمی اپنے روزے کی اس ڈھال سے کام لے تو یہ ڈھال یقیناً اُسے بُرائیوں سے بچائے گی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

جہنم سے آزادی حاصل کرنے کا مہینہ

۵۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا کَانَ اَوَّلُ لَیْلَةٍ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ

الشَّيَاطِيْنُ وَمَرَدَةُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ يُفْتَحْ مِنْهَا بَابٌ وَفُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ فَلَمْ يُغْلَقْ مِنْهَا بَابٌ وَيُنَادِيْ مُنَادٍ يَّا بَاغِيَ الْخَيْرِ اَقْبِلْ وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ اَقْصِرْ، وَلِلّٰهِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیاطین اور جن جو برائی پھیلانے پر کمربستہ رہتے ہیں باندھ دیئے جاتے ہیں، اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور پھر ان میں سے کوئی دروازہ کھولا نہیں جاتا، اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور پھر ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ اور پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے برائی کے طالب رک جا۔ اور اللہ کی طرف سے بہت سے لوگ ہیں جو آگ سے بچنے والے ہیں ——— اور یہ ہر رات کو ہوتا ہے۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ)

چونکہ اسلامی تقویم کا انحصار قمری مہینوں پر ہے اور قمری مہینے ہلال سے شروع ہوتے ہیں اس لیے اسلام میں ہر مہینے کا آغاز رات سے ہوتا ہے چنانچہ ماہ رمضان ہلال دیکھنے کیساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر یہاں رمضان کی پہلی رات کے متعلق فرمایا گیا کہ اس میں شیاطین اور برائی اور فساد پھیلانے والے جن باندھ دیئے جاتے ہیں۔

رمضان کی اس خصوصیت کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اس کا ظہور ساری دنیا میں نہیں ہوتا بلکہ یہ صرف مومنین صالحین کی بستیوں کے اندر ہوتا ہے

شیطان کیونکر جکڑا جاتا ہے؟

رمضان کی آمد پر شیاطین کا باندھا جانا دراصل اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ مومن صالح رمضان کا آغاز ہوتے ہی اپنی خواہشات نفس پر وہ پابندیاں قبول کرتا ہے جو عام زمانے میں اس پر نہیں ہوتیں مثلاً عام زمانے میں تو پانی اس کے لیے حلال ہے لیکن رمضان کے زمانے میں بارہ سے چودہ پندرہ گھنٹے تک وہ اس پر حرام ہو جاتا ہے۔ عام دنوں میں اس کے لیے کھانا کھانا اور خواہش نفس کو پورا کرنا بشرطیکہ جائز طریقہ سے ہو حلال ہے لیکن رمضان کے زمانے میں یہ چیزیں کئی کئی گھنٹے کے لیے اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مومن پر رمضان کے مہینے میں اس کے نفس، اس کی خواہشات اور آزادئ عمل پر ایسی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں جو دوسرے دنوں میں نہیں ہوتیں۔ جب مومن ان پابندیوں کو قبول کر لیتا ہے اور اپنے آپ کو ان میں جکڑ لیتا ہے تو اس کا شیطان بھی جکڑا جاتا ہے۔ اگر مومن بھی اپنے آپ کو خواہش نفس کا غلام بنائے رکھے اور شریعت کی پابندیاں قبول نہ کرے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا شیطان جکڑا نہیں گیا بلکہ بدستور کھلا پھر رہا ہے اور اپنا کام کئے جا رہا ہے۔ پس خوب سمجھ لیجئے کہ جس شخص نے اپنے نفس پر شریعت کی پابندیاں عائد کر لیں تو جس لمحے اس نے ایسا کیا اسی لمحے اس کا شیطان بھی زنجیروں میں جکڑا گیا۔ اسی طرح ادھر اس نے اپنے اوپر شریعت کی پابندیاں عائد کیں ادھر جنت کے سارے دروازے اس کیلئے کھل گئے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے گئے ـــــ یہ ہے مفہوم شیطانوں کے جکڑے جانے کا، دوزخ کے دروازے بند ہونے کا اور جنت کے دروازے کھلنے کا۔ اور یہ چیزیں وہیں ظہور پذیر ہوں گی جہاں مومنین صالحین بستے ہوں۔ اس سے یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ ساری دنیا کے شیطان باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اور آج کل تو شیاطین خود مسلمانوں کی بستیوں کے اندر بھی اس زمانے میں کھلے پھرتے ہیں۔ جو لوگ مسلمان ہوتے ہوئے رمضان کے احکام کی خلاف ورزیاں کرنے میں ظاہر بات ہے کہ ان کا شیطان تو نہ صرف

یہ کہ کھلا پھر رہا ہے بلکہ ان پر پوری طرح سے تسلط جمائے ہوئے ہے ——— مقید تو صرف اُس شخص کا شیطان ہوگا جس نے اپنی خواہشاتِ نفس پر پابندیاں عائد کیں اور اللہ کے احکام کو خود پر نافذ کیا۔

رمضان کی پکار

● پھر فرمایا کہ پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب آگے بڑھ اور اے بُرائی کے طالب رُک جا!

پکارنے والے سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص کھڑا ہو کر یہ صدا لگاتا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی پابندی کرنے والوں کو رمضان کی آمد ہی سے اس بات کی اطلاع مل جاتی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے بچنے کا زمانہ آگیا ہے۔ جس وقت اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ لیا گیا ہے تو یہ اعلان اپنے اندر اس بات کو متضمن رکھتا ہے کہ اے بھلائی کے طالب، آگے بڑھ، یہ وقت ہے بھلائیاں لوٹ لے جانے کا۔ وہ زمانہ شروع ہوگیا ہے جس میں تو بھلائیوں سے اپنی جھولی بھر سکتا ہے ——— اور اے بُرائی کے طالب! رُک جا، یہ وقت ہے تیرے رُک جانے کا، کیونکہ وہ زمانہ شروع ہوگیا ہے جس میں تیری ایک معمولی سی بُرائی بہت بڑی بُرائی قرار پائے گی اور اس کے برعکس تیری ایک معمولی سی بھلائی بھی بے انتہا نشوونما پائے گی، اس لیے اب تو تجھے بُرائیوں سے رُک ہی جانا چاہیئے!

آگ سے چھٹکارا پانے والے

● پھر فرمایا کہ رمضان کے زمانے میں اللہ کے بہت سے بندے ایسے ہیں جو آگ سے آزادی حاصل کرتے ہیں۔

عَتِیق کے معنی ہیں آزاد آدمی کے۔ اِس ارشاد سے مراد یہ ہے کہ بہت سے بندے ایسے ہیں جو اس زمانے میں اپنے نیک اعمال کی بدولت جہنم کی آگ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے ہر انسان کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنا شُمار ان بندوں میں کرانے کا سامان کہاں تک کر رہا ہے۔

"اور یہ ہر رات کو ہوتا ہے"

اِس سے مراد یہ ہے کہ رمضان المبارک کی جو برکتیں اور خصوصیات اس کی پہلی رات کو ظہور میں آتی ہیں اُن سب کا ظُہور رمضان کی ہر رات میں بدستور جاری رہتا ہے۔

اَلفَصلُ الثَّالِثُ

ہزار مہینوں سے بہتر رات

۶۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَتَاكُمْ رَمَضَانُ، شَهْرٌ مُّبَارَكٌ، فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ صِيَامَهٗ، تُفْتَحُ فِيْهِ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَتُغْلَقُ فِيْهِ اَبْوَابُ الْجَحِيْمِ وَتُغَلُّ فِيْهِ مَرَدَةُ الشَّيَاطِيْنِ، لِلّٰهِ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ، مَنْ حُرِمَ خَيْرَهَا فَقَدْ حُرِمَ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَالنَّسَائِیُّ)

حضرت ابو ہُریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر رمضان کا مبارک مہینہ آیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تم پر روزے فرض کئے ہیں۔ اس میں آسمان (یعنی جنّت) کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین باندھ دیئے جاتے ہیں۔ اس میں اللہ کی طرف سے ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ جو اس

رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ بس محروم ہی رہ گیا۔ (احمد ، نسائی)

یہ حدیث بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن خطبات میں سے ہے جو آپ رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر صحابہ کرامؓ کو اس مبارک مہینے کی اہمیت اور برکات سے آگاہ فرمانے کے لیے دیا کرتے تھے۔ اس میں آپؐ نے پہلی بات یہ بتائی کہ رمضان بڑی ہی برکت والا مہینہ ہے اور اس کے روزے اُمّت پر فرض کئے گئے ہیں۔

بَرَکَۃ کے اصل معنی ہیں افزائش کے۔ رمضان کے مہینے کو مبارک مہینہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے اندر بھلائیاں نشوونما پاتی ہیں اور نیکیوں کو افزونی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس برائیاں بڑھنے کے بجائے سکڑتی چلی جاتی ہیں اور ان کی ترقی رُک جاتی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی : اس مہینے میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

اس سے مراد لَیْلَۃُ الْقَدْر ہے۔ یعنی وہ رات جس میں قرآن مجید نازل ہوا، جیسا کہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝

"ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے۔ شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول انسانیت کے لیے عظیم الشان خیر کی حیثیت رکھتا ہے اور انسان کے لیے اس سے بڑی کوئی خیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا گیا کہ وہ رات جس میں یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری انسانی تاریخ میں کبھی ہزار مہینوں

میں بھی انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا ہے جو اس ایک رات میں ہوا ہے۔
ہزار مہینوں کے لفظ کو گنے ہوئے ہزار نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ اس سے بہت بڑی کثرت
مراد ہے ——— چنانچہ اس رات میں جو اپنی بھلائی کے لحاظ سے ہزار مہینوں
سے بھی افضل ہے، جس آدمی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اس سے لو لگائی اس
نے بہت بڑی بھلائی حاصل کر لی ——— کیونکہ اس رات میں بندے کا اللہ
کی طرف رجوع کرنا یہی معنی تو رکھتا ہے کہ اسے اس رات کی اہمیت کا پورا پورا احساس
ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر یہ کتنا بڑا احسان
کیا ہے کہ اپنا کلام نازل فرمایا اس لیے جس آدمی نے اس رات میں عبادت کا اہتمام
کیا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ اس کے
دل میں قرآن مجید کی صحیح قدر و قیمت کا احساس موجود ہے۔

جو اس رات کی بھلائی سے محروم رہا وہ محروم ہی رہ گیا

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اس رات میں اللہ کی عبادت کے لیے
کھڑا نہیں ہوتا تو گویا اُسے قرآن مجید کی اُس نعمتِ عظمیٰ کا احساس ہی نہیں ہے جو
اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔ اگر اُسے اس بات کا احساس ہوتا تو وہ ضرور
رات کے وقت عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور شکر ادا کرتا کہ اے اللہ یہ تیرا
احسانِ عظیم ہے کہ تو نے مجھے قرآن جیسی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بے شک یہ
بھی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے کھانے کے لیے روٹی اور پہننے کے لیے
لباس عنایت فرمایا۔ لیکن تیرا اصل احسان عظیم مجھ پر یہ ہے کہ تو نے مجھے ہدایت
دی اور دینِ حق کی روشنی دکھائی۔ مجھے تاریکیوں میں بھٹکنے سے بچایا اور علمِ حقیقت
کی وہ روشن شمع عطا کی جس کی وجہ سے میں دنیا میں سیدھے راستے پر چل کر
اس قابل ہوا کہ تیری خوشنودی حاصل کر سکوں ——— پس جس شخص کو اس

نعمت کی قدر و قیمت کا احساس ہوگا وہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے کھڑا ہوگا اور اس کی بھلائی لوٹ لے جائے گا۔ لیکن جو شخص اس رات میں ادائے شکر کے لیے خدا کے حضور کھڑا نہیں ہوا وہ اس کی بھلائی سے محروم رہ گیا اور درحقیقت ایک بہت بڑی بھلائی سے محروم رہ گیا۔

روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کریں گے

۷۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ، یَقُوْلُ الصِّیَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّہَوَاتِ بِالنَّہَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ، وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ فَیُشَفَّعَانِ۔

(رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے کہ اے رب، میں نے اس کو دن بھر کھانے (پینے) اور شہوات سے روکے رکھا، تو میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما ــــــ اور قرآن کہتا ہے کہ (اے رب) میں نے اسے رات کو سونے سے روکے رکھا، تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما ــــــ پس دونوں کی شفاعت قبول فرمالی جائے گی۔ (بیہقی)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ روزہ اور قرآن کوئی جاندار ہیں جو کھڑے ہو کر یہ بات کہتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک روزہ دار کا روزہ رکھنا اور قرآن پڑھنے والے کا

قرآن پڑھنا دراصل خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے۔ جب روزہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے کہ اس بندے نے روزہ رکھا ہے تو اس پیشی کے ساتھ ساتھ روزے کی یہ شفاعت بھی موجود ہوتی ہے کہ یہ بندہ آپ کی خاطر دن بھر بھوکا پیاسا رہا۔ یہ چھپ کر کھا پی سکتا تھا اور دوسری خواہشات بھی پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس بندے نے چونکہ آپ کی خاطر دن بھر بھوک پیاس برداشت کی ہے اور اپنی دوسری خواہشات پر بھی پابندیاں عائد کیے رکھی ہیں اس لیے اس کے قصور معاف فرما دیجئے۔

اسی طرح ایک شخص رات کو جو قرآن مجید پڑھتا ہے جب وہ قرآن اللہ کے حضور پیش کیا جاتا ہے کہ آج اس بندے نے اتنا قرآن پڑھا ہے تو قرآن کا وہ پیش کیا جانا ہی خود اپنے اندر ایک شفاعت رکھتا ہے اور وہ شفاعت یہ ہے کہ اس بندے نے دن بھر کے روزے سے تھکا ماندہ ہونے کے باوجود آپ کی رضا جوئی کی خاطر رات کو (نماز میں) کھڑے ہو کر قرآن پڑھا اس لیے اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں ——

ظاہر بات ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز مومنین صالحین کی شفاعت فرمائیں گے اسی طرح خود آدمی کے اپنے اعمال بھی اس کے حق میں شفیع ہوتے ہیں۔ آدمی کے اعمال خدا کے حضور یہ شفاعت کرتے ہیں کہ یہ آدمی یہ یہ نیکیاں کر کے آیا ہے اس لیے اسے بخش دیجئے اور اس سے درگزر فرمایئے۔

—— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق —— اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے حق میں روزے اور قرآن مجید کی یہ شفاعتیں قبول فرما لیتا ہے۔

لیلۃ القدر سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے

۸- عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ دَخَلَ رَمَضَانُ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ هٰذَا الشَّهْرَ قَدْ

حَضَرَكُمْ وَفِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ. مَنْ حُرِمَهَا فَقَدْ حُرِمَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَلَا يُحْرَمُ خَيْرَهَا اِلَّا كُلُّ مَحْرُوْمٍ

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَہ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رمضان کا مہینہ آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ مہینہ تمہارے اُوپر آیا ہے اور اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے، جو اس سے محروم رہ گیا وہ تمام کی تمام بھلائی سے محروم رہ گیا اور اس کی بھلائی سے محروم وہی رہتا ہے جو ہے ہی بے نصیب۔ (ابن ماجہ)

اس مقام پر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ لیلۃ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ وہ کونسی رات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ یعنی وہ رات اکیسویں ہو سکتی ہے بائیسویں نہیں، تئیسویں ہو سکتی ہے چوبیسویں نہیں، وعلیٰ ھذا القیاس وہ آخری عشرہ کی طاق رات ہے۔ یہ فرمانے کے بعد اس بات کو بغیر تعین کے چھوڑ دیا گیا کہ وہ کونسی رات ہے۔ عام طور پر لوگ ستائیسویں رمضان کے بارے میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ لیلۃ القدر ہے لیکن یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ رمضان کی ستائیسویں شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ البتہ جو بات تعین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ فقط یہ ہے کہ وہ آخری عشرے کی کوئی طاق رات ہے۔

لیلۃ القدر کا قطعی طور پر تعین نہ کرنے میں یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس اُمید پر اللہ کے حضور کھڑا ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلۃ القدر ہو ——— لیلۃ القدر اگر اس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جس چیز کا طالب تھا وہ اُسے مل گئی، اس کے بعد اس نے جو چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت

میں گزاریں تو وہ اس کی نیکی میں مزید اضافے کی موجب بنیں گی۔

اس مقام پر ایک اور بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ چونکہ ساری دنیا میں رمضان کی ایک ہی تاریخیں نہیں ہوتیں اور ان میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے اس لیے یہ بات یقین سے کہنا مشکل ہے کہ کس آدمی کو واقعی وہ اصل رات میسر آگئی۔ اس لیے ایک طالب صادق کو ہر رمضان میں اسے تلاش کرنا چاہیے۔ رمضان کا جو آخری عشرہ اعتکاف کے لیے مقرر کیا گیا ہے اسمیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اعتکاف کا ثواب آدمی کو الگ ملے اور چونکہ اعتکاف کی حالت میں اس کی تمام طاق راتیں عبادت میں گزریں گی اس لیے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ اسے ان میں کبھی نہ کبھی وہ رات بھی لازماً مل جائے گی۔

بعض لوگ اپنی جگہ لیلۃ القدر کی تلاش کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ رات کو باہر نکل کر یہ دیکھا جائے کہ فضا میں کوئی ایسی علامت پائی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ قدر کی رات ہے۔ فضا میں کوئی ایسا نور برس رہا ہے جس سے اس کا لیلۃ القدر ہونا ثابت ہو جائے۔ لیکن دراصل یہ طرزِ فکر مطابقِ حقیقت نہیں ہے۔ بیشک یہ نور برستا ہے، لیکن یہ نور تو پورے رمضان میں اور رمضان کی ہر رات میں برستا ہے، البتہ اس کے لیے وہ آنکھیں چاہئیں جو اس کو دیکھ سکیں۔ یہ نور درحقیقت آپ کی عبادات کے اندر برستا ہے۔ یہ نور تقویٰ اور خدا کی رضا طلبی کے اندر آپ کے انہماک میں بھلائیوں کے لیے آپ کے ذوق و شوق میں، اور عبادات کے لیے آپ کے خلوص و اہتمام میں اور فی الجملہ آپ کے ایک ایک عمل میں برستا ہے۔

رحمت، مغفرت اور نجات کا مہینہ

۹۔ عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي آخِرِ يَوْمٍ مِنْ شَعْبَانَ

فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيمٌ، شَهْرٌ مُبَارَكٌ، شَهْرٌ فِيهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ شَهْرٍ. جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيضَةً وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا مَنْ تَقَرَّبَ فِيهِ بِخَصْلَةٍ مِنَ الْخَيْرِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ وَمَنْ أَدَّى فَرِيضَةً فِيهِ كَانَ كَمَنْ أَدَّى سَبْعِينَ فَرِيضَةً فِيمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيهِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ، مَنْ فَطَّرَ فِيهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً لِذُنُوبِهِ وَعِتْقَ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْتَقِصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ. قُلْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ لَيْسَ كُلُّنَا نَجِدُ مَا نُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلَىٰ مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ تَمْرَةٍ أَوْ شَرْبَةٍ مِنْ مَاءٍ وَمَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِي شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَآخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ. وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوكِهِ فِيهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ (رواه البیہقی)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ کو خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو، تمہارے اوپر ایک بڑا بزرگ مہینہ سایہ فگن ہوا ہے۔ یہ بڑی

برکت والا مہینہ ہے، یہ وہ مہینہ ہے جس کی ایک رات ایسی ہے کہ ہزار مہینوں سے زیادہ افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (اس کے) روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کے قیام کو تطوع (یعنی نفل) قرار دیا ہے۔ جس شخص نے اس مہینے میں کوئی نیکی کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ اس شخص کے مانند ہے جس نے دوسرے دنوں میں کوئی فرض ادا کیا (یعنی اسے ایسا اجر ملے گا جیسا کہ دوسرے دنوں میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے) اور جس نے اس مہینے میں ایک فرض ادا کیا تو وہ ایسا ہے جیسے دوسرے دنوں میں اس نے ستر فرض ادا کیے ——— اور رمضان صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے، اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کا مہینہ ہے، اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے اگر کوئی شخص اس میں کسی روزہ دار کا روزہ کھلوائے تو وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور اس کی گردن کو دوزخ کی سزا سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس روزہ دار کے لیے روزہ رکھنے کا ہے، بغیر اس کے کہ اس روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو ——— حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ ہم نے (یعنی صحابہ کرامؓ نے) عرض کیا یا رسول اللہ، ہم میں سے ہر ایک کو یہ توفیق میسر نہیں ہے کہ کسی روزہ دار کا روزہ کھلوائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ اجر اُس شخص کو (بھی) دے گا جو کسی روزہ دار کو دودھ کی لسّی سے روزہ کھلوا دے یا ایک کھجور کھلا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے ——— اور جو شخص کسی روزہ دار کو

پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پانی پلائے گا (اس حوض سے پانی پی کر) پھر اسے پیاس محسوس نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا ——— اور یہ وہ مہینہ ہے کہ جس کے آغاز میں رحمت ہے، وسط میں مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ سے رہائی ہے ——— اور جس نے رمضان کے زمانے میں اپنے غلام سے ہلکی خدمت لی اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور اس کو دوزخ سے آزاد کر دے گا۔ (بیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے (اور پہلے بھی یہ بات بیان کی جاچکی ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فضائلِ رمضان اور روزوں سے متعلق ہدایات بالعموم رمضان کے آنے سے پہلے شعبان کے جمعوں یا دوسرے اجتماعات میں دی ہیں۔ رمضان کے زمانے میں جو خطبے حضورؐ دیتے تھے اگرچہ ان میں بھی احکام کا بیان ہوتا تھا لیکن خاص طور پر آپؐ کا طریقہ یہ تھا کہ رمضان کے آنے سے پہلے شعبان کے مہینے میں ایسے خطبے ارشاد فرمایا کرتے تھے جن میں رمضان کی فضیلت اور روزوں کے احکام کا بیان ہوتا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس خطبے میں فرمایا:

"لوگو! تمہارے اُوپر ایک مہینہ ایسا آرہا ہے جو عظیم ہے، یعنی بزرگی والا اور بڑی برکت والا ہے۔

——— ماہ رمضان کے بزرگ یا بابرکت ہونے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس کے دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں فی نفسہٖ کوئی ایسی برکت شامل ہے جو لوگوں کو خود بخود حاصل ہو جاتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایسے مواقع پیدا کر دیتا ہے جن کی بدولت تم اس کی بے حد حساب برکات سے فائدہ

اُٹھا سکتے ہو۔ اس مہینے میں ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ عبادت کرے گا اور نیکیوں کے جتنے زیادہ کام کرے گا وہ سب اس کے لیے زیادہ سے زیادہ روحانی ترقی کا وسیلہ بنیں گے۔ اس لیے اس مہینے کے بزرگ اور بابرکت ہونے کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر تمھارے لیے برکتیں سمیٹنے کے بے شمار مواقع فراہم کردیے گئے ہیں۔

● "یہ وہ مہینہ ہے جس کی ایک رات ایسی ہے کہ ہزار مہینوں سے زیادہ افضل ہے"

اس سے مراد لیلۃ القدر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا۔ اس کے ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ کبھی ہزار مہینے میں بھی نوعِ انسانی کی فلاح کا وہ کام نہ ہوا ہوگا جتنا اس ایک رات میں ہوا۔

● "اللہ تعالیٰ نے رمضان کے (دنوں کے) روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کے قیام کو تطوّع (یعنی نفل) قرار دیا ہے"

تطوُّع سے مراد وہ کام ہے جو آدمی اپنے دل کی خوشی سے (Voluntarily) انجام دے، بغیر اس کے کہ وہ اس پر فرض کیا گیا ہو۔

رمضان میں دن کے روزے کو فرض اور رات کے قیام کو نفل قرار دے کر فرض اور نفل عبادات دونوں کے فائدوں کو جمع کردیا گیا ہے۔ ادائے فرض کے فائدے کچھ اور ہیں اور ازخود اپنی رضا و رغبت سے بغیر اس کے کہ کوئی چیز لازم قرار دی گئی ہو، اللہ کی عبادت کرنے کے فائدے کچھ اور ہیں۔ اگر ایک آدمی اپنی ڈیوٹی بجالاتا ہے تو وہ اس پر ایک اور قسم کے انعام کا مستحق ہوتا ہے اور اگر وہ اپنی ڈیوٹی سے بڑھ کر اپنے دل کی رضا سے کوئی خدمت بجالاتا ہے تو اس پر وہ کسی اور قسم کے انعام کا مستحق ہوتا ہے ایک چیز وہ ہے جس پر وہ مزدوری کا مستحق ہے اور دوسری چیز وہ ہے جس

پر اسے بونس (Bonus) کا مستحق قرار دیا جائے گا ——— معلوم ہوا کہ اس ماہ میں دو قسم کے مواقع پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ ایک تو ڈیوٹی عائد کر دی گئی ہے جس کے اجر کے آپ الگ مستحق ہوں گے اور ایک چیز آپ کے تطوّع پر چھوڑ دی گئی ہے کہ آپ اپنی رضا اور رغبت سے راتوں کو عبادت کے لیے کھڑے ہوں تو اس پر آپ کو مزید انعامات ملیں گے ——— یہ گویا اس چیز کی تشریح ہے کہ اس بزرگ مہینے میں کیا کیا برکتیں رکھ دی گئی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا: "جس شخص نے اس مہینے میں کوئی نیکی کر کے اللہ کا قُرب حاصل کرنے کی کوشش کی تو اس کو ایسا اجر ملے گا جیسا کہ دوسرے دنوں میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے، اور جس نے اس مہینے میں فرض ادا کیا تو وہ ایسا ہے جیسے دوسرے دنوں میں اس نے ستّر فرض ادا کیے۔"

چونکہ یہاں فَرِیْضَۃ کے مقابلے میں خَصْلَۃً مِّنَ الْخَیْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اس لیے ان سے خود بخود یہ معنی نکلتے ہیں کہ ان سے مراد نفل نیکی ہے۔ یعنی جو آدمی اس مہینے میں نفل کے طور پر کوئی نیکی کرتا ہے اسے اس پر ایسا اجر ملے گا جیسا دوسرے زمانے میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے۔

<u>رمضان کے زمانے میں یہ فرق کیوں ہوتا ہے؟</u>

رمضان کے زمانے میں عام دنوں کی بہ نسبت اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام دنوں میں تو آدمی بڑی حد تک یا ایک حد تک انفرادی حیثیت سے عبادات و فرائض کی بجا آوری کرتا ہے لیکن رمضان کا زمانہ وہ ہے جسے بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے نیکی کا موسم قرار دیا گیا ہے۔ ساری قوم بیک وقت روزہ رکھتی اور افطار کرتی ہے۔ سب ایک ہی وقت میں جا کر تراویح پڑھتے اور دوسری عبادات انجام دیتے ہیں۔ اس طرح پوری قوم کے اندر نیکی کا ایک عام ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔

اس لیے اس زمانے میں نیکی خوب پھلتی پھولتی ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح بارش کے زمانے میں فصل عام زمانے کی بہ نسبت خوب بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ چنانچہ رمضان کے دنوں میں آدمی جو نیکی بھی کرتا ہے وہ اکیلے اُسی کی نیکی نہیں ہوتی بلکہ بے شمار نیکیاں مل کر اُس کو بڑھا رہی ہوتی ہیں۔ پھر چونکہ رمضان نیکیوں کا عام موسم ہے اس لیے اس زمانے میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا فیضان بھی عام ہوتا ہے۔ ایک آدمی جو نفل نماز بھی پڑھے، کسی کے ساتھ بھلائی کا جو کام بھی کرے، جو خیرات بھی کرے اُسے ان پر اتنا اَجر ملے گا جتنا عام دنوں میں فرض ادا کرنے پر ملتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے زمانے میں اگر کوئی شخص فرض ادا کرتا ہے، خواہ وہ زکوٰۃ ہو یا نماز یا روزہ، تو اُسے اس کا اتنا اَجر ملے گا جتنا اس کو عام دنوں میں ستّر گنا زکوٰۃ نکالنے' ستّر نمازیں پڑھنے یا ستّر روزے رکھنے کا ملتا ہے۔

____صَبْر کے معنی عربی لُغت میں باندھنے اور روکنے کے ہیں۔ اِس مقام پر صبر سے مراد ہے اپنے آپ کو اتنا باندھنا اور ایسا ضبطِ نفس کرنا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے اور اس کی اطاعت کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔

یہ جو ارشاد فرمایا کہ صبر ہی کا ثواب جنّت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی اگر جنّت حاصل کرتا ہے تو اسی وجہ سے حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے نفس پر اتنا قابو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس کی خواہشاتِ نفس بے لگام نہیں ہونے پاتیں اور وہ ان کو رضائے الٰہی کا پابند بنا دیتا ہے۔

اِس صبر کی جتنی مشق رمضان میں ہوتی ہے اتنی اور کسی زمانے میں نہیں ہوتی۔ رمضان میں آدمی مسلسل چوبیس گھنٹے صبر کی مشق کرتا ہے۔ سحری کا وقت

اس کے اُٹھنے کا نہیں ہوتا لیکن وہ اُٹھتا ہے۔ وہ وقت کھانے کا نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے نفس سے کہتا ہے کہ تیرے رب نے یہی وقت تیرے کھانے کے لیے مقرر کیا ہے، اس وقت کھانا ہے تو کھالے ورنہ دن بھر تجھے بھوکا رہنا پڑے گا۔ گویا اس طرح اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرتے ہوتے آپ کے نفس کی لگام آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور آپ اس پر سوار ہوتے ہیں (بجائے اس کے کہ یہ آپ پر سوار ہو)۔ جس وقت اللہ کا حکم ہوا بس اُسی وقت کھانا پینا بند ہوگیا۔ پھر آپ کا ہاتھ نہ کھانے کی طرف بڑھتا ہے نہ پینے کی طرف۔ دن بھر آپ پر خواہ کچھ ہی کیوں نہ گزرے لیکن آپ اپنے نفس کو بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ پھر جس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے آپ فوراً افطار کرتے ہیں —— آگے وہ احادیث آرہی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات نہایت پسند ہے کہ بندہ افطار میں جلدی کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روزہ دار محض اللہ کے حکم کی وجہ سے رُکا ہوا تھا ورنہ اس کو ایسی بھوک اور پیاس لگی تھی کہ وہ کھانے اور پینے میں ایک لمحے کی دیر کرنے والا نہیں تھا۔

یہ ہے وہ طریقہ جس سے آپ کو اپنے نفس پر قابو پانے اور صبر کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے، اور یہی وہ صبر ہے جس کا نتیجہ جنت ہے کیونکہ اسی صبر کی بدولت تو آپ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی خلاف ورزی سے بچیں اور ہر حال میں اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔

● پھر فرمایا کہ "یہ مہینہ مواساۃ کا مہینہ ہے"۔

مُوَاسَاۃ کے معنی ہیں باہم ہمدردی کرنا اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنا —— رمضان کے شَہْرُ الْمُوَاسَاۃ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی کرنے کی تربیت دی جاتی ہے کیونکہ ایک بھوکے آدمی کو جب خود بھوک کا احساس ہوتا ہے تبھی اسے اس

بات کا پتہ چلتا ہے کہ دوسرے پر بھوک میں کیا گزرتی ہے اور وہ کس قسم کی ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔

"اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔"

—— کوئی شخص ناپ تول کر یا حساب لگا کر تو یہ نہیں بتا سکتا کہ رمضان میں اس کی آمدنی کتنی بڑھی یا اس کی تنخواہ میں کیا اضافہ ہوا لیکن لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں کا یہ تجربہ ہے کہ رمضان میں جیسا کچھ وہ کھا پی لیتے ہیں عام حالات میں وہ ان کو میسر نہیں آتا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لازماً کوئی ایسی برکت ہے جو اس مہینے میں اللہ تعالیٰ مومن کے رزق میں ڈال دیتا ہے۔

پھر فرمایا کہ "جو شخص کسی کا روزہ کھلوائے تو وہ اس کے گناہوں کی مغفرت کا اور اس کی گردن کو دوزخ کی سزا سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ملے گا بغیر اس کے کہ اس روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔"

—— یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل اتنا محدود نہیں ہے کہ وہ روزہ دار کے اجر میں سے کاٹ کر افطار کرانے والے کو کچھ دے دے کہ یہ تیرے افطار کرانے کا اجر ہے۔ نہیں بلکہ جتنا اجر روزہ رکھنے والے کو ملتا ہے اتنا ہی اجر اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے اس شخص کو دیتا ہے جو روزہ افطار کراتا ہے۔

یاد رہے کہ یہ اجر اُن افطاریوں کے لیے نہیں ہے جو بطور ریاکاری کے اپنی شان و شوکت کے مظاہرے کے لیے کرائی جاتی ہیں اور جن سے مقصود لوگوں کو یہ دکھانا ہوتا ہے کہ حضرت کتنے دولت مند ہیں اور راہ خدا میں کس قدر خرچ کرنے والے ہیں۔

—— یہاں جس اجر کا ذکر کیا جا رہا ہے وہ تو اُن لوگوں کے لیے ہے جو اللہ کی خاطر لوگوں کو افطار کرائیں اور زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان لوگوں کو افطار کرائیں جو بہتر افطار کرنے کے قابل نہیں ہیں، بہ نسبت اس کے کہ کھاتے پیتے لوگوں کو افطار کرایا جائے۔

اُوپر کی سطور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جن ارشادات کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، ہم میں سے ہر ایک کو اتنی توفیق نہیں ہے کہ روزہ دار کا روزہ کھلواتے۔

—— اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اجر تو ہر اس شخص کا ہے جو کسی روزہ دار کو دودھ یا لسی پلادے یا ایک کھجور کھلادے یا ایک گھونٹ پانی پلادے ——

یعنی یہ اجر بڑی بھاری افطاریوں کا نہیں ہے بلکہ یہ تو محض روزہ کھلوادینے کا اجر ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسے ہی سادہ طریقے سے کھلوایا گیا ہو۔

● پھر فرمایا "اور جو شخص کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے پانی پلائے گا پھر اسے اس وقت تک پیاس محسوس نہ ہوگی جب تک کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے"

احادیث میں آتا ہے کہ میدان حشر میں پانی کا ایک حوض ہوگا جسے حوض کوثر کہا جاتا ہے۔ اس حوض کے محافظ اور نگران خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ اس سے پانی وہی پیئے گا جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پلائیں گے۔ کسی دوسرے شخص کو اس سے پانی پینے کا موقع نہیں ملے گا۔ پھر اس حوض کے سوا میدان حشر میں کوئی دوسرا حوض بھی نہیں ہوگا جہاں سے کوئی شخص پانی پی سکے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس حوض پر صرف انہی لوگوں کو آنے دیں گے جو اس قابل ہوں گے کہ آگے جا کر جنت میں داخل ہو سکیں۔ چنانچہ جو شخص ایک روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتا ہے اسے میدانِ حشر میں حوض کوثر سے پانی ملے گا تاآنکہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔

میدان حشر کے متعلق یہ بات بھی احادیث سے معلوم ہوتی ہے کہ وہاں کوئی سایہ اللہ کے سائے کے سوا نہیں ہوگا اور وہ سایہ صرف نیک آدمیوں کو میسر آئے گا۔ بد آدمیوں کے لیے وہ سایہ نہیں ہوگا —— تصور کیجئے کہ اس میدانِ حشر میں جہاں

اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، اُس شخص کو برابر پانی ملتا رہے گا جو یہاں کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کے کھانا کھلاتا ہے۔

- پھر فرمایا "اور یہ وہ مہینہ ہے جس کے آغاز میں رحمت ہے اوسط میں مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ سے رہائی ہے"

—— یعنی اِدھر اس مبارک مہینے کی آمد پر آپ روزہ رکھنا شروع کرتے ہیں اُدھر اللہ کی رحمت آپ پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ پھر رمضان کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اللہ تعالیٰ آپ کے قصوروں سے درگزر فرمالیتا ہے اور آپ کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اس طرح جب آپ رمضان کے آخر تک پہنچتے ہیں تو اِدھر آپ آخری روزہ رکھتے ہیں اُدھر آپ کو دوزخ کے خطرے سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

اس آزادی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب آخری روزے کی وجہ سے آپ کو دوزخ سے آزادی حاصل ہو گئی تو اب آپ آزاد ہیں، جو جی چاہے کرتے پھریں اب آپ پر کوئی گرفت نہیں ہوگی —— ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ بعض لوگ رمضان کے ختم ہوتے ہی وہ سب پابندیاں توڑ ڈالتے ہیں جو اس مبارک مہینے میں اُنھوں نے اپنے اُوپر عائد کر رکھی ہوتی ہیں —— بس رمضان ختم ہوا اور وہ عین عید کے دن (یعنی شوال کی پہلی ہی تاریخ کو) سینما دیکھنے چلے گئے اور پھر اس سے آگے بڑھ کر ناچ گانے کا شوق بھی کر لیا —— پھر کہیں بیٹھ کر کچھ تھوڑا بہت جوا وغیرہ بھی کھیل لیا۔ یہ سب کچھ اگر ایک شخص نے کر ڈالا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اِدھر وہ دوزخ کے خطرے سے آزاد ہوا اور اُدھر اُس نے پھر اس میں کودنے کی تیاریاں شروع کر دیں —— ظاہر بات ہے کہ کوئی بھلا آدمی جس کے دل میں ایمان کی کچھ روشنی اور خوفِ خدا کی کوئی رمق موجود ہو

یہ کھیل نہیں کھیل سکتا۔

● "اور جس نے رمضان کے مہینے میں اپنے غلام (یا نوکر) سے ہلکی خدمت لی اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے آزاد کر دے گا۔"

——— رمضان کے زمانے میں آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ جیسے وہ خود روزے سے ہے ویسے ہی اس کا نوکر بھی روزے سے ہے۔ نوکر اور خادم سے اس طرح کس کر خدمت لینا کہ جیسے وہ تو روزے سے نہیں ہے اور آپ ہیں کہ روزہ رکھ کر نڈھال ہوئے جاتے ہیں، یہ کسی بھلے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ جو شخص رمضان کے زمانے میں اپنے نوکر کے کام میں تخفیف کرتا ہے اور اس سے نرمی برتتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ کی آگ سے بچاتے گا۔

موجودہ زمانے میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اپنے ماتحتوں سے ——— نوکروں یا غلاموں سے نہیں ——— رمضان کے زمانے میں معمولی سے زیادہ کس کر کام لیتے ہیں۔ گویا وہ اپنے عمل سے یہ بات کہتے ہیں کہ اچھا تم نے روزہ رکھنے کی گستاخی کی ہے۔ اب تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہاری ڈیوٹی عام دنوں سے دگنی ہو گئی ہے تاکہ تمہیں ذرا معلوم تو ہو کہ اس زمانے میں اور ہمارے زیر سایہ تم روزہ رکھنے کی جسارت کرتے ہو۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت یہ ہے کہ اگر تمہارا کوئی غلام بھی ہے (یہاں مملوک کا لفظ ہے، خادم کا لفظ نہیں ہے) تو تمہارا یہ کام ہے کہ رمضان کے زمانے میں اس سے سخت قسم کا کام نہ لو۔ بلکہ اس کے ساتھ نرمی برتو اور اسے ہر ممکن سہولت دو۔ اس بات کا صلہ، اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے لیے یہ ہو گا کہ وہ تمہیں دوزخ کی آگ سے بچاتے گا۔

رمضان المبارک میں حضورؐ کی شفقت اور فیاضی کی دو مثالیں

۱۰۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ شَھْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ کُلَّ اَسِیْرٍ وَّ اَعْطٰی کُلَّ سَائِلٍ (رَوَاہُ الْبَیْھَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب رمضان آتا تھا تو آپؐ ہر اسیر کو رہا کر دیتے تھے اور ہر سائل کو کچھ نہ کچھ دیتے تھے۔

(بیہقی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت، رحم دلی، نرمی، عطا، بخشش اور فیاضی کا جو حال عام دنوں میں تھا وہ تو تھا ہی، کہ یہ چیزیں آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ کا حصہ تھیں، لیکن رمضان المبارک میں خاص طور پر ان میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ آپؐ معمول سے کہیں زیادہ گہرائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور اللہ کے ساتھ آپ کی محبت میں شدت آجاتی تھی اس لیے آپ کی نیکیاں بھی عام دنوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ جیسا کہ خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ عام دنوں میں فرض ادا کرنے کا جو ثواب ملتا ہے وہ رمضان میں نفل ادا کرنے پر ملتا ہے۔ اس لیے آپ رمضان کے زمانے میں بہت کثرت سے نیکیاں کرتے تھے۔ یہاں حضورؐ کے عمل میں سے دو چیزیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ اسیروں کو رہا کرنا اور مانگنے والوں کو دینا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کے بارے میں کہ آپؐ رمضان

میں ہر قیدی کو رہا کر دیتے تھے " محدثین کے درمیان بحثیں پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی جرم کی پاداش میں قید ہے تو اس کو محض رمضان کے مہینے کی وجہ سے رہا کر دینا یا سزا نہ دینا کس طرح انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو سکتا ہے؟ ——— اس بنا پر اس قول کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں۔ بعض محدثین کے نزدیک اس سے مراد جنگی قیدی ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنے ذمے کا قرض ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے ماخوذ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے ان کا قرض ادا کر کے ان کو آزاد کر دیتے تھے۔ اس طرح کی بعض دوسری توجیہات بھی اس قول کی کی گئی ہیں ——— اگر غور کیا جائے تو اس کی ایک اور شکل بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً آج کل کے زمانے میں ایک طریقہ پیرول (Parole) پر رہا کرنے کا ہے، یعنی قیدی کو قول لے کر رہا کر دینا۔ قیدی کو اس اُمید پر رہا کر دیا جاتا ہے کہ وہ رہائی کی مدت ختم ہونے کے بعد خود واپس آجائے گا ——— وہ معاشرہ ایسا تھا کہ اس میں اس بات کا اندیشہ نہیں تھا کہ جس قیدی کو رہا کیا جا رہا ہے وہ یہ خیال کر کے کہ اب مجھے کون پکڑتا ہے کسی ایسی جگہ فرار ہو جائے گا جہاں سے اس کو پکڑنا ممکن نہ رہے گا۔ وہ تو ایسے لوگ تھے کہ اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جاتا تھا تو خود آکر اس کا اعتراف کرتے تھے تاکہ ان کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے ——— اس لیے ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ عمل کی یہ شکل رہی ہو کہ حضورؐ ایسے لوگوں کو، جن کی سزا معاف نہ ہو سکتی تھی، رمضان کے زمانے میں مشروط طور پر رہا کر دیتے ہوں تاکہ وہ رمضان کا مبارک زمانہ اپنے گھروں پر گزاریں۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

جنّت ایک رمضان کے بعد دوسرے رمضان کی آمد تک مسلسل سجائی جاتی ہے

۱۱۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْجَنَّۃَ تُزَخْرَفُ لِرَمَضَانَ مِنْ رَأْسِ الْحَوْلِ اِلٰی حَوْلٍ قَابِلٍ، قَالَ فَاِذَا کَانَ اَوَّلُ یَوْمٍ مِنْ رَمَضَانَ هَبَّتْ رِیْحٌ تَحْتَ الْعَرْشِ مِنْ وَرَقِ الْجَنَّۃِ عَلَی الْحُوْرِ الْعِیْنِ فَیَقُلْنَ یَا رَبِّ اجْعَلْ لَنَا مِنْ عِبَادِكَ اَزْوَاجًا تَقَرُّ بِهِمْ اَعْیُنُنَا وَتَقَرُّ اَعْیُنُهُمْ بِنَا۔ (رَوَاهُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جنت رمضان کے لیے سال کے آغاز سے آنے والے سال تک (یعنی ایک رمضان کے خاتمے سے اگلے رمضان کی آمد تک) سجائی جاتی ہے۔ جب رمضان کا پہلا دن آتا ہے تو عرش کے نیچے ایک ہوا چلتی ہے جو جنت کے پتوں میں گزرتی ہوئی آہو چشم حوروں کے اُوپر پہنچتی ہے۔ اس ہوا کو پا کر حوریں کہتی ہیں کہ اے ہمارے رب، ہمیں اپنے (نیکوکار) بندوں میں سے ایسے شوہر عطا کر جن سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور جن کی آنکھیں ہم سے ٹھنڈی ہوں۔ (بیہقی)

اِس ارشاد کے ذریعے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کو یہ بتایا ہے کہ اگر تم رمضان کا زمانہ اللہ تعالیٰ کی پوری پوری فرمانبرداری کے جذبے سے اور گہرے تعلق کے ساتھ روزے رکھنے اور دوسری نیکیاں کرنے میں گزارد

تو یہ کچھ نعمتیں جنت میں تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔

رمضان کی آخری رات کو اُمّتِ مُسلمہ کی مغفرت ہو جاتی ہے

۱۲۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ یُغْفَرُ لِاُمَّتِهٖ فِیْ اٰخِرِ لَیْلَةٍ فِیْ رَمَضَانَ، قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَهِیَ لَیْلَةُ الْقَدْرِ قَالَ لَا وَلٰکِنَّ الْعَامِلَ اِنَّمَا یُوَفّٰی اَجْرَهٗ اِذَا قَضٰی عَمَلَهٗ (رواہ احمد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: رمضان کی آخری رات کو میری امت کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ، کیا یہی وہ لیلۃ القدر ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، نہیں، بلکہ مزدور کو اس کی مزدوری اُس وقت دی جاتی ہے جب وہ اپنا کام مکمل کر لیتا ہے۔ (احمدؒ)

حضورؐ کا یہ ارشاد سُن کر کہ "رمضان کی آخری رات میری اُمّت کی مغفرت ہو جاتی ہے" صحابہ کرامؓ کو یہ خیال ہوا کہ شاید وہی رات لیلۃ القدر ہو اور اسی کی فضیلت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہو۔ لیکن آپؐ نے فرمایا کہ ایسا لیلۃ القدر ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مزدور کو اُجرت کام مکمل ہونے پر دی جاتی ہے۔ میری اُمّت کی اُجرت یہ ہے کہ اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

اُمّت کی مغفرت ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ اُن لوگوں کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے جو نہ روزے رکھیں اور نہ دوسرے احکام کی پیروی کریں، بلکہ یہ

مغفرت اُمّت کے ان لوگوں کی ہوتی ہے جو روزے رکھتے ہیں اور احکامِ خداوندی کی پیروی کرتے ہیں ——— اُس زمانے میں یہ بات قابلِ تصوّر ہی نہ تھی کہ کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں بھی ہو اور پھر روزہ بھی نہ رکھے۔ اُس وقت پوری کی پوری اُمّت روزہ رکھتی تھی۔ رمضان کا سارا زمانہ خدا کی عبادت میں گزارتی تھی، ہر طرح کی بُرائیوں سے بچتی تھی اور عام دنوں سے بڑھ کر نیکیاں کرتی تھی۔ اس لیے یہاں اُس اُمّت کی مغفرت کا ذکر کیا گیا ہے ——— ورنہ اس سے مراد وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں کہ جب رمضان آتا ہے تو ان کی بے راہ روی اور سرکشی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ روزہ رکھنا تو ایک طرف رہا اُلٹا برسرِ عام بے تکلفی سے کھاتے پیتے ہیں۔ رمضان کی آخری رات کو ایسے لوگوں کی مغفرت ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے بلکہ اُس رات شاید اُن کے خلاف مقدمۂ فوجداری ——— Prosecution Case ——— مکمل ہو جاتا ہوگا۔

بَابُ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ

اس باب میں وہ احادیث ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رویتِ ہلال کس طرح ثابت ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ شعبان کے ہلال کا رمضان سے رمضان کے ہلال کا روزوں سے اور شوال کے ہلال کا عید سے کیا تعلق ہے۔

(اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ)

رمضان کے آغاز اور اختتام کا فیصلہ رویتِ ہلال پر ہے

۱۳ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ — قَالَ اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ لَيْلَةً فَلَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوا الْعِدَّةَ ثَلَاثِيْنَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تک (رمضان کا) ہلال نہ دیکھ لو روزہ رکھنا شروع نہ کرو، اور جب تک (شوال کا) ہلال نہ دیکھ لو افطار نہ کرو (یعنی روزہ رکھنا ختم نہ کرو) پھر اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ

سے چاند تم کو نظر نہ آئے تو اس کا اندازہ کر لو ——— دوسری روایت
میں یہ الفاظ ہیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : مہینہ
۲۹ دن کا ہوتا ہے ۔ پس روزہ رکھنا شروع نہ کرو جب تک کہ (رمضان
کا) ہلال نہ دیکھ لو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے وہ تم کو نظر
نہ آئے تو (شعبان کے) تیس ۳۰ دن پورے کرو۔ (متفق علیہ)

اِس حدیث میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ جب تک رمضان کا ہلال دیکھ نہ لو روزے رکھنا شروع نہ کرو۔ لَاتَصُوْمُوْا کا یہ مطلب نہیں کہ روزہ نہ رکھو بلکہ مراد یہ ہے کہ روزہ رکھنا شروع نہ کرو، یعنی رمضان کا ہلال دیکھے بغیر رمضان کا آغاز قرار نہ دو۔ پھر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم میں سے ہر شخص چاند دیکھے بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ حَتّٰی تَرَوْا، یعنی تم لوگ چاند دیکھ لو۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی بستی یا علاقے کے لوگوں نے عام طور پر چاند دیکھ لیا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص انفرادی طور پر چاند دیکھے بلکہ عام لوگوں کا اس کو دیکھ لینا ہر آدمی کے لیے حجت ہے۔

رویتِ ہلال کی یہ تاکید اس لیے فرمائی گئی کہ رمضان کے آغاز کی علامت رویتِ ہلال ہے کوئی حساب نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ چونکہ جنتری کے حساب سے آج شعبان ختم ہو رہا ہے اور آج رمضان کا ہلال ہونا چاہیے اس لیے اعلان کر دیا جائے کہ کل سے رمضان شروع ہو رہا ہے۔ نہیں بلکہ رمضان کے آغاز کے لیے رویتِ ہلال ضروری ہے۔

یہ جو فرمایا کہ جب تک (شوال کا) ہلال دیکھ نہ لو، افطار نہ کرو، اس سے مراد روزہ افطار کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رمضان ختم ہو گیا اور شوال کا چاند نظر آگیا تو اب روزے ختم ہوئے اور کل عید الفطر ہے۔ یعنی رمضان کا آغاز بھی ہلال دیکھ کر ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی ہلال دیکھ کر ہوتا ہے،

فیصلہ رویتِ ہلال سے ہے، کسی حساب سے نہیں۔

آگے چل کر فرمایا کہ مطلع صاف نہ ہونے کی بنا پر اگر چاند تم سے مخفی رہ جائے تو پھر اندازہ کرلو۔ "اندازہ کرو" کا مفہوم دوسری روایت سے واضح ہوگیا ہے، اور وہ اس طرح کہ فرمایا گیا "مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے، پس روزہ رکھنا شروع نہ کرو جب تک ہلال نہ دیکھ لو، پھر اگر وہ تم سے چھپا رہ جائے تو ۳۰ دن پورے کرو" مطلب یہ ہوا کہ اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو پھر شعبان کا مہینہ ۳۰ دن کا قرار دیا جائے گا اور رمضان کا اعلان کسی حساب کی بنا پر نہیں کیا جائے گا (جیسا کہ بعض لوگوں نے "اندازہ کرلو" کے الفاظ سے یہ مطلب نکالنے کی کوشش کی ہے)۔ اس صورت میں رمضان کا آغاز شعبان کے ۳۰ دن پورے کرنے کے بعد ہوگا۔

اگر ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کیے جائیں

۱۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، صُوْمُوْا لِرُؤْیَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْیَتِهٖ فَاِنْ غُمَّ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوْا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلَاثِیْنَ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی: چاند دیکھ کر روزوں کا آغاز کرو اور چاند دیکھ کر روزے ختم کرو۔ پھر اگر چاند مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے تم سے چھپا رہ جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ (متفق علیہ)

اِس جگہ ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام میں عبادات

کے لیے شمسی مہینوں کو نہیں بلکہ قمری مہینوں کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اہلِ عرب شمسی مہینوں سے واقف نہیں تھے اور انکی سہولت کیلئے قمری مہینوں کو اختیار کر دیا گیا۔ قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب شمسی مہینوں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ مشرکین عرب میں نسی کا طریقہ رائج تھا جس کی مذمت قرآن مجید میں کی گئی ہے (اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ۔۔۔۔ الخ۔ التوبہ۔ ۳۷) عرب میں نسی کی دو صورتیں رائج تھیں۔ "ایک صورت تو یہ تھی کہ اہلِ عرب جنگ جدل اور غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دے لیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اُس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ اُن زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۶ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف سینتیسویں سال ایک مرتبہ اصلی ذی الحجہ کی ۹۔ ۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمائی تھی کہ اس سال حج کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اُس تاریخ پر آگیا ہے جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے"[1]

اِس سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ عرب شمسی مہینوں سے ناواقف نہیں تھے ـــــ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عاید کردہ فرائض

---

[1] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۹۳ (حاشیہ ۳۷)

کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب جن اہم مصالح کی بنا پر اختیار کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے بندے زمانے کی تمام گردشوں میں ہر قسم کے حالات اور کیفیات میں اس کے احکام کی اطاعت کے خوگر ہوں۔ مثلاً رمضان کبھی گرمی میں اور کبھی برسات میں اور کبھی سردیوں میں آتا ہے، اور اہل ایمان ان سب بدلتے ہوئے حالات میں روزے رکھ کر فرمانبرداری کا ثبوت بھی دیتے ہیں اور بہترین اخلاقی تربیت بھی پاتے ہیں۔ اسی طرح حج بھی قمری حساب سے مختلف موسموں میں آتا ہے اور ان سب طرح کے اچھے اور بُرے حالات میں خدا کی رضا کے لیے سفر کر کے بندے اپنے خدا کی آزمائش میں پورے بھی اُترتے ہیں اور بندگی میں پختگی بھی حاصل کرتے ہیں"۔[1]

علاوہ بریں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ "ایک عالمگیر دین جو سب انسانوں کے لیے ہے، آخر کس شمسی مہینے کو روزے اور حج کے لیے مقرر کرے؟ جو مہینہ بھی مقرر کیا جائے گا وہ زمین کے تمام باشندوں کے لیے یکساں سہولت کا موسم نہیں ہو سکتا۔ کہیں وہ گرمی کا زمانہ ہوگا اور کہیں سردی کا۔ کہیں وہ بارشوں کا موسم ہوگا اور کہیں خشکی کا۔ کہیں فصلیں کاٹنے کا زمانہ ہوگا اور کہیں بونے کا"۔[2] اس لیے یہ لازم تھا کہ ان عبادات کے زمانوں کا تعین کرنے کے لیے شمسی حساب کے بجائے قمری حساب کو اختیار کیا جاتا تاکہ ہر خطۂ زمین پر بسنے والے لوگ ہر موسم میں ان عبادات کی بجا آوری سے ان کے اخلاقی اور روحانی فوائد حاصل کرسکیں۔

شمسی حساب کو عبادات کی بنیاد قرار دینے کی یہ قباحت بھی بالکل واضح ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا

---

[1] ، [2] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۹۳ (حاشیہ ۳۲)

علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا' یا جنتری اس کے دین کا جزو بن جاتی، جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائض دینی ادا نہ کر سکتا۔ اس لیے اس کے بجائے آسمان کے اوپر ہر ماہ جنتری کا جو بہت بڑا ورق اُلٹتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو تاریخیں جاننے کا ذریعہ بنایا تاکہ اگر کوئی آدمی صحرا میں زندگی گزار رہا ہو یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر اس کی کٹیا بنی ہوئی ہو تو وہ بھی اسے دیکھ کر یہ معلوم کرلے کہ اب رمضان کا چاند ہو گیا ہے اور روزے شروع ہو گئے ہیں' یا شوال کا چاند نکل آیا ہے اور کل عیدالفطر ہے۔

رویتِ ہلال کے سلسلے میں مطلع غبار آلود یا ابر آلود ہونے کی صورت میں جو دِقّت پیش آسکتی ہے اس کے متعلق یہ ہدایت کردی گئی کہ ۲۹ کو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں مہینے کے ۳۰ دن پورے کئے جائیں۔ اس طرح اُس تذبذب کو ختم کردیا گیا جو ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آسکنے کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔

اسلامی عبادات کے لیے قمری حساب کو اختیار کرنے کی حکمت

۱۵- عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِنَّا اُمَّۃٌ اُمِّیَّۃٌ لَا نَکْتُبُ وَلَا نَحْسُبُ، اَلشَّھْرُ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَعَقَدَ الْاِبْھَامَ فِی الثَّالِثَۃِ، ثُمَّ قَالَ اَلشَّھْرُ ھٰکَذَا وَھٰکَذَا وَھٰکَذَا یَعْنِیْ تَمَامَ الثَّلَاثِیْنَ، یَعْنِیْ مَرَّۃً تِسْعًا وَّعِشْرِیْنَ وَمَرَّۃً ثَلَاثِیْنَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ہم ایک اُمّی قوم ہیں، نہ لکھتے ہیں نہ (نجوم کا) حساب جانتے ہیں ـــــ مہینہ یوں ہے اور یوں ہے

اور یوں ہے (آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھوں کے اشارے سے
یہ بات سمجھائی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھلی رکھیں)، اور تیسری
مرتبہ اپنے انگوٹھے کو بند کر لیا (مراد یہ تھی کہ مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے)
——— پھر آپؐ نے فرمایا کہ مہینہ یوں ہے اور یوں ہے اور یوں
ہے، یعنی پورے ۳۰ دن کا ——— اس طرح ایک مرتبہ حضورؐ
نے یہ سمجھایا کہ مہینہ ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور دوسری دفعہ یہ سمجھایا کہ
مہینہ تیس۳۰ دن کا ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)

اہل عرب کا یہ عام قاعدہ تھا کہ وہ انگلیوں سے گن کر حساب لگاتے تھے یعنی اگر دس کہنا ہوتا تھا تو دونوں ہاتھ کھلی انگلیوں کے ساتھ اٹھا کر اشارے سے بیان کرتے تھے یا دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو گن کر بتاتے تھے، جیسا کہ خود ہمارے ہاں دیہات میں ان پڑھ لوگوں کا اب بھی یہ قاعدہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عربی زبان میں ان اعداد کے لیے الفاظ نہیں تھے بلکہ عربوں میں یہ عام طریقہ رائج چلا آرہا تھا اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھوں کی انگلیوں سے یہ بات سمجھائی کہ مہینہ کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ دن کا۔ یہ گویا آپؐ نے اُمیّت کی تشریح فرمائی کہ ہم پڑھے لکھے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہم نجوم کا حساب جانتے ہیں کہ اس ذریعے سے مہینوں کے آغاز اور اختتام کا حساب لگاتے رہیں۔ ہمارے اندر پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر ہے اس وجہ سے ہمارے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم حساب کتاب کے ذریعے سے یہ طے کریں کہ کون سا مہینہ شروع ہوا ہے اور کون سا ختم ہوا ہے ——— اس طریقے سے حضورؐ نے اس چیز کی حکمت سمجھا دی کہ قمری مہینوں کے آغاز و اختتام کی علامت رؤیتِ ہلال کو کیوں قرار دیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو اس زمانے میں سائنس کا ہیضہ ہو گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ سائنس کا زمانہ ہے۔ اس کے اندر تو بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کی تحقیق کی جاسکتی ہے کہ چاند ہوا یا نہیں۔ مطلع پر چاند اگر موجود ہو اور فضا صاف نہ ہونے کی وجہ سے نظر نہ آرہا ہو تو ایسے آلات موجود ہیں جن کی مدد سے اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔ خود علمِ فلکیات اور علمِ نجوم (Astronomy) کے ذریعے سے بھی اس بات کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ آج چاند ہوگا یا نہیں ——— لیکن یہ لوگ دراصل اس بات کو نہیں سمجھتے کہ ایک عالم گیر دین کبھی مصنوعی ذرائع پر انحصار نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ انہی ذرائع پر انحصار کرے گا جو زیادہ سے زیادہ فطری ہوں اور جن پر اعتماد کر کے جدید ترین سائنسی ترقیوں سے بہرہ ور لوگ بھی اس دین پر عمل پیرا ہو سکیں، اور وہ لوگ بھی ایک سچے مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکیں جو ان ترقیوں کے ثمرات سے محروم یا ناآشنا ہوں۔

رویتِ ہلال کے لیے سائنسی ذرائع کو اختیار کرنے کا مشورہ دینے والے حضرات کی طرف سے ایک یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اس طریقے سے سب مسلمانوں کی عید (کم از کم پاکستان میں) ایک ہی دن ہو سکے گی کیونکہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے اور رویتِ ہلال میں اختلاف واقع ہو جانے سے مسلمانوں کے اس اتحاد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک ہی دن ہونی چاہیے۔ "لیکن درحقیقت یہ فکر و نظر کی غلطی ہے۔ ایسی باتیں دین سے ناواقفیت کی بنا پر کی جاتی ہیں اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کرتے ہیں جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انہیں بڑی فکر ہے۔"

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیے وہ تو بالکل ہی لغویات کہتے ہیں، کیونکہ تمام دنیا میں رویتِ ہلال کا لازماً اور ہمیشہ

ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ملک یا کسی ملک کے ایک بڑے علاقہ میں سب مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے، مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیئے' اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی برائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔ خدا کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج لوگ ریڈیو کی موجودگی کی بناپر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ایک دن ہونی چاہیئے، مگر آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک پورے برصغیر ہند تو درکنار' اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اس حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے، دُور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدت عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے ملک میں صرف ایک ریڈیو سٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو' بلکہ ہر شخص کے پاس، یا ہر گھر کے لوگوں کے پاس' یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو' ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا یہ آلات بھی اب دین کا ایک لازمی جز قرار پائیں گے؟ خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کیے ہیں' جن سے ہر مسلمان کے لیے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات

گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اس کے دین کا ایک جز بن جائے، بلکہ اس نے سورج کے طلوع و غروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا، جنھیں ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لیے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رویت کو علامت قرار دیا ہے جو عالم گیر مشاہدے کی چیز ہے اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہو گیا اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اس کے دین کا ایک جز بن جاتی، جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائض دینی ادا نہ کر سکتا اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رویت سے ساری دنیا میں یا رُوئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے، رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دور تو اُس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہو جاتی کہ چاہے انھیں روٹی اور کپڑا میسر ہو یا نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو اُن کے پاس ایک ٹرانزسسٹر ضرور ہو۔" [1]

رمضان اور ذوالحجہ (اجر و فضیلت کے لحاظ سے) کبھی ناقص نہیں ہوتے

۱۶۔ عَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، شَهْرَا عِيْدٍ لَا يَنْقُصَانِ، رَمَضَانُ

---

[1] خطبہ عید الفطر صفحہ ۱۸، (شائع کردہ ایوانِ ادب، اُردو بازار، لاہور)

وَذُوالْحِجَّةِ ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْہِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عید کے دو مہینے کبھی ناقص نہیں ہوتے، رمضان اور ذوالحجہ۔ (متفق علیہ)

رمضان کو عید کا مہینہ اس لیے کہا گیا کہ اس کے فوراً بعد عید آتی ہے۔ گویا عید الفطر کا حقیقی تعلق رمضان کے ساتھ ہے۔

بعض لوگوں نے حضورؐ کے اس ارشاد کا یہ مطلب لیا ہے کہ یہ دونوں مہینے کبھی بیک وقت ۲۹ دن کے نہیں ہوتے لیکن یہ ایک غیر علمی توجیہ ہے۔ رمضان اور ذوالحجہ کے مہینے ایک سال میں ۲۹ دن کے ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ یہ مہینے خواہ ۲۹ دن کے ہوں خواہ ۳۰ دن کے، ان کے اَجر و ثواب اور فضیلت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر رمضان ۳۰ کے بجائے ۲۹ دن کا ہو تو اُس کے روزوں کے اَجر و ثواب میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی (یعنی ۲۹ روزوں کا ثواب ۳۰ روزوں سے کم ہو گا)۔ اسی طرح ذوالحجہ کے عشرۂ اوّل کی جو فضیلت اور اَجر و ثواب ہے اس میں کوئی کمی اس وجہ سے نہیں ہو گی کہ یہ مہینہ ۳۰ کے بجائے ۲۹ دن کا ہوا۔

رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ رکھنا ممنوع ہے

۱۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا یَتَقَدَّمَنَّ اَحَدُکُمْ رَمَضَانَ بِصَوْمِ یَوْمٍ اَوْ یَوْمَیْنِ اِلَّا یَکُوْنَ رَجُلٌ کَانَ یَصُوْمُ

صَوْمًا فَلْيَصُمْ ذٰلِكَ الْيَوْمَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھے۔ اِلّا یہ کہ کوئی شخص معمولاً اس دن روزہ رکھا کرتا ہو۔ ایسا آدمی اس دن کا روزہ رکھ سکتا ہے۔ (متفق علیہ)

آگے ایک اور حدیث آرہی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بیان ہوئی ہے کہ نصف شعبان کے بعد کوئی روزہ نہ رکھا جائے۔ اس کی دو مصلحتیں ہیں:

ایک یہ ہے کہ رمضان سے پہلے متصل زمانے میں روزے رکھنے سے آدمی کو ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے کہ اس کے لیے رمضان کے روزے پورا کرنا مشکل ہو جائے۔ جن لوگوں کو کبھی رمضان کے علاوہ نفل یا قضا روزے رکھنے کا تجربہ ہوا ہے انھیں یہ علم ہے کہ بعض اوقات رمضان کے زمانے کے دس روزوں کی نسبت دوسرے زمانے کا ایک دن کا روزہ آدمی کی طاقت توڑ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان کے زمانے میں چونکہ پوری قوم مل کر روزہ رکھ رہی ہوتی ہے اس لیے ایک ایک فرد کا روزہ دوسرے کے لیے مددگار ہوتا ہے۔ ان دنوں میں روزہ رکھنے کا ایک عام ماحول اور فضا پیدا ہو جاتی ہے جس کی بدولت آدمی پورے مہینے کے روزے آسانی سے رکھ لیتا ہے۔ لیکن رمضان کے ماسوا دوسرے دنوں میں ایک آدمی اکیلا ہی روزہ رکھنے والا ہوتا ہے اور اس کے گردوپیش کا پورا ماحول اس سے غیر موافق ہوتا ہے اس لیے اس کو روزہ رکھنے میں زیادہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے جس کے نتیجے میں وہ معمول سے کہیں

زیادہ کمزوری اور ضعف محسوس کرتا ہے۔ اس لیے تاکید فرمادی گئی کہ رمضان سے متصل پہلے زمانے میں کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔

دوسری مصلحت یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی کا مزاج فرض میں نہ کسی کمی کو برداشت کرتا ہے نہ اضافے کو۔ چونکہ رمضان کے روزے فرض ہیں اس لیے اس سے بالکل متصل پہلے روزہ رکھنے سے اس بات کا احتمال ہوسکتا ہے کہ فرض عبادت میں اضافہ ہوجائے۔ ایک شخص اپنی جگہ یہ خیال کرکے کہ مجھے رمضان کے ۳۰ دنوں کا ثواب تو ملے گا ہی، کیوں نہ ایک آدھ دن کے ثواب کا مزید اضافہ ہو جائے، اور وہ رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزے رکھنا شروع کردے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے فرض عبادت میں ایک اضافہ اپنی طرف سے تجویز کرلیا۔ یہی فعل وہ بدعت ہے جس کو گمراہی قرار دیا گیا اور اس کا انجام نارِ جہنم بتایا گیا۔ آخر اہلِ کتاب نے اور پھر خود مسلمانوں نے خدا کی شریعت میں جو اضافے کیے ہیں وہ اسی طرح تو ہوئے ہیں کہ مختلف چیزوں کو نیکیاں قرار دے کر فرائض کے ساتھ ملا لیا گیا۔ پھر ان کی اتنی فضیلتیں اپنے ذہن سے تصنیف کی گئیں اور ان کی اس قدر اشاعت اور تاکید کی گئی کہ وہ فرائض سے بھی بڑھ کر اہم قرار پائیں۔ اس طرح وہ آخرکار خدا کی شریعت کا جز بن گئیں، اور جز بھی ایسا کہ جو اصل سے زیادہ اہم ہوگیا۔ اس لیے اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ جس چیز کی جو حد مقرر کردی گئی ہے اس میں نہ کسی کو کمی کرنے کا اختیار ہے نہ اضافہ کرنے کا۔ اگر ظہر کے چار فرض مقرر کیے گئے ہیں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کو کم کرکے تین قرار دے دے یا اضافہ کرکے ۵ رکعت ٹھہرا لے۔ بندے کا کام اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے فرض میں اضافہ

کرتا ہے تو حقیقت میں وہ عبادت نہ ہوئی بلکہ اپنی جگہ ایک قانون سازی ہوئی۔
اب جو حقیقی قانون ساز ہے اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ اس کے بنائے ہوئے قانون کی بے کم وکاست تعمیل کی جائے۔ اس میں کمی بیشی کرنا ایک صریح نافرمانی ہے بلکہ بعض حالات میں کفر ہے — نماز میں یہ چیز مسنون ہے کہ امام جب فرض نماز پڑھا کر فارغ ہو جائے تو فوراً پلٹ جائے تاکہ مزید قبلہ رُخ بیٹھے رہنا بھی نماز کا ایک حصّہ نہ بن جائے۔ یہ ہدایت بھی کی گئی کہ نماز باجماعت سے فارغ ہو کر سنّتیں منتشر ہو کر الگ الگ پڑھی جائیں اور جماعت کی صحیح ہیئت کو برقرار نہ رہنے دیا جائے تاکہ سنّتیں بھی نماز باجماعت کا حصہ نہ بن جائیں۔ اسی طرح جب روزوں کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کر دیا گیا تو اب کسی کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کے ساتھ ملا کر کچھ اور دنوں کا روزہ بھی رکھے کیونکہ یہ چیز فرض میں اضافے کی موجب بن سکتی ہے۔
یہ جو فرمایا کہ اِلَّا یَکُوْنَ رَجُلٌ کَانَ یَصُوْمُ صَوْمًا.... الخ یعنی جو شخص معمولاً اس دن کا روزہ رکھتا ہو اس کو ایسا کرنے کی اجازت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مہینے کی آخری تاریخوں کو نفلی روزہ رکھنے کا اہتمام کرتا ہو، یا ہفتے کا کوئی ایک دن اس نے نفلی روزے کے لیے خاص کر رکھا ہو اور وہ دن اتفاق سے رمضان سے پہلے آپڑے تو اس کے لیے اُس دن کا روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اپنے معمول کے مطابق عمل کر سکتا ہے۔

—— اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ ——

نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا ممنوع ہے

۱۸۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، إِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُومُوا۔

(رَوَاهُ أَبُوْدَاؤْدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَه وَالدَّارِمِيُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جب شعبان کا مہینہ آدھا گزر چکے تو اس کے بعد روزہ نہ رکھو۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

اس حکم کی تشریح پہلے گزر چکی ہے اور اس کی ایک استثنائی شکل بھی بیان ہو چکی ہے۔ دوسری استثنائی شکل نذر یا قضا کے روزوں کے متعلق ہے۔ اس کی توضیح اپنے مقام پر آئے گی۔

رمضان کے لیے شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کرنے کا حکم

۱۹- عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَحْصُوا هِلَالَ شَعْبَانَ لِرَمَضَانَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی: رمضان کے لیے شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کرو۔ (ترمذی)

یہ ہدایت اس لیے فرمائی کہ اگر شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام نہ کیا جائے تو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ شعبان کی کون سی تاریخ ہے۔ چنانچہ رمضان کے آغاز کا فیصلہ کرنے میں بھی مشکل پیش آسکتی ہے کیونکہ اگر رمضان کی آمد آمد پر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آیا تو اس بات کا تعین کرنا ناممکن ہو جاتا کہ

آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے یا تیس؟ - اگر شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کیا گیا ہو تو ۲۹ تاریخ کو رمضان کا ہلال نظر نہ آنے کی صورت میں شعبان کے ۳۰ دن پورے کئے جائیں گے۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ آج شعبان کی ۳۰ تاریخ ہے تو چاند خواہ نظر آئے یا نہ آئے اگلے روز سے رمضان کا آغاز قرار دیا جائے گا۔ اس لیے رمضان کے آغاز کا صحیح فیصلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

رسُولُ اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شعبان اور رمضان کے مسلسل روزے رکھا کرتے تھے

۲۰- عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ مَا رَأَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ شَھْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ اِلَّا شَعْبَانَ وَرَمَضَانَ۔

(رَوَاہُ اَبُوْدَاوٗدَ، وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَہ)

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی مسلسل دو مہینے کے روزے رکھنے کا اہتمام کرتے نہیں دیکھا مگر شعبان اور رمضان کے۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

اس سے پہلے حضورؐ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھا جائے لیکن اس حدیث سے آپؐ کا اپنا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اکثر (ہمیشہ نہیں بلکہ اکثر) شعبان اور رمضان کے مسلسل روزے رکھا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ دوسروں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ حضورؐ کے بعض معمولات ایسے تھے جو آپ ہی کے لیے خاص تھے اور دوسروں کے لیے ان کا اِتّباع درست

نہیں یا کم از کم ان پر وہ لازم نہیں ہیں۔ مثلاً تہجد کی نماز حضورؐ کے لیے لازم تھی جبکہ دوسروں کے لیے نہیں ہے۔ دوسرے لوگ یہ نماز پڑھیں تو ان کے لیے باعث اجر و ثواب ہے، نہ پڑھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح کچھ اور چیزیں بھی ایسی ہیں جو صرف حضورؐ ہی کی خصوصیت ہیں۔ مثلاً عام مسلمانوں پر یہ پابندی ہے کہ وہ ایک وقت میں چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پابندی نہیں تھی۔ خود قرآنِ مجید ہی میں آپؐ کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس طرح کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا حق حضورؐ کو نہیں دیا گیا جبکہ عام مسلمانوں کو وہ حاصل ہے۔ مثلاً عام مسلمانوں کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ کسی کتابیہ سے نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی ——— اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضورؐ کی کچھ خصوصیات ہیں جن میں کوئی دوسرا شخص حضورؐ کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ انہی میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ حضورؐ شعبان کے روزے رکھا کرتے تھے جبکہ عام مسلمانوں کے لیے نصف شعبان کے بعد ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

شک کے دن کا روزہ رکھنا جائز نہیں

۲۱۔ عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ قَالَ مَنْ صَامَ الْيَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ فَقَدْ عَصَى اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رَوَاهُ اَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے اس دن

کا روزہ رکھا جس کے بارے میں شک ہو تو اُس نے ابوُ القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

(ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

یہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے اپنے الفاظ ہیں۔ گویا وہ اپنے الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت نقل فرما رہے ہیں کہ شک کے دن کا روزہ نہ رکھا جائے۔ شک کے دن سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ بات مشکوک ہو کہ آیا آج رمضان شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے اور مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا تو یہ بات مشکوک ہو گئی کہ آیا واقعی چاند ہوا ہے یا نہیں ــــــ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرکے کہ ممکن ہے چاند ہو گیا ہو اگلے دن کا روزہ رکھ لے تو یہ غلط ہے کیونکہ اسی کو شک کا دن کہا گیا ہے اور اس میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کی بنیاد شک پر نہیں بلکہ یقین پر ہونی چاہیئے مثلاً بعض لوگوں کو اس امر میں شک ہوتا ہے کہ جس بستی یا علاقے میں وہ مقیم ہیں وہاں جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ جمعہ بھی پڑھ لیتے ہیں اور ظہر کے چار فرض بھی پڑھتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا جمعہ بھی مشکوک اور ظہر کے ۴ فرض بھی مشکوک۔ یہ طریقہ صحیح نہیں اگر انھیں یقین ہے کہ جمعہ ہو جاتا ہے تو پھر صرف جمعہ پڑھیں، ۴ فرض نہ پڑھیں۔ اگر یقین ہے کہ جمعہ نہیں ہوتا تو پھر ظہر پڑھیں جمعہ نہ پڑھیں۔ لیکن شک کے ساتھ عبادت کرنا غلط ہے ــــــ ایسا ہی معاملہ رمضان کا ہے کہ اگر یقین ہے کہ آج رمضان شروع ہو گیا ہے تو روزہ رکھیے، اگر یقین نہیں تو پھر شک کے ساتھ روزہ رکھنا صحیح نہیں۔ اس صورت کے بارے میں پہلے یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ ۲۹ تاریخ کو ہلال نظر نہ آنے کی صورت میں شعبان کے ۳۰ دن پورے کیے جائیں۔

رویتِ ہلال کی شہادت صرف مومن کی معتبر ہے

۲۲- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْہِلَالَ یَعْنِیْ ہِلَالَ رَمَضَانَ فَقَالَ اَتَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ قَالَ نَعَمْ، قَالَ اَتَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ قَالَ نَعَمْ، قَالَ یَا بِلَالُ اَذِّنْ فِی النَّاسِ اَنْ یَّصُوْمُوْا غَدًا۔

(رَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ وَابْنُ مَاجَۃ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ ایک بدّو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے، یعنی رمضان کا چاند۔ آپؐ نے اُس سے پوچھا، کیا تُو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں؟ اُس نے کہا، ہاں۔ آپؐ نے پھر پوچھا: کیا تُو گواہی دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں؟ اُس نے کہا، ہاں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو آواز دے کر کہا کہ اے بلالؓ! لوگوں میں اعلان کر دو کہ کل سے روزہ رکھیں۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

یہ ایک بڑی اہم حدیث ہے جس سے بہت سے مسائل معلوم ہوتے ہیں:

پہلی بات یہ ہے کہ رویتِ ہلال کے سلسلے میں شہادت کی ضرورت

اُس وقت پیش آتی ہے جب مطلع صاف نہ ہو اور عام لوگ چاند نہ دیکھ سکے ہوں۔ اگر مطلع صاف ہو تو ہزاروں لاکھوں آدمی چاند کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اس لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے برعکس اگر مطلع صاف ہو لیکن ہزاروں آدمی کوشش کے باوجود اس کو نہ دیکھ سکے ہوں تو اس صورت میں اگر کوئی ایک آدمی یا چند آدمی آکر شہادت دیں کہ اُنھوں نے چاند دیکھ لیا ہے تو ان کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی خواہ وہ کیسے ہی متقی اور پرہیزگار ہوں۔ آخر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ آسمان پر جو چیز نمایاں ہو اسے لاکھوں آدمی تو نہ دیکھ سکیں اور بس دو چار یا دس پانچ آدمی دیکھ لیں۔ البتہ اگر مطلع صاف نہ ہو اور بادل فضا پر چھائے ہوئے ہوں، اس صورت میں دو چار آدمی اگر یہ بیان کریں کہ ہم نے چاند دیکھ لیا ہے تو ان کی یہ شہادت قابلِ غور ہو سکتی ہے، کیونکہ اس بات کا امکان ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بدلی کہیں سے ہٹی ہو اور کسی کو چاند نظر آگیا ہو۔ اس صورت میں صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ یہ لوگ سچے ہیں یا نہیں اور خود نماز روزے کے پابند ہیں یا نہیں"۔[1]

"دوسری بات یہ ہے کہ رویتِ ہلال کے معاملے میں پہلے مرحلے پر شہادت درکار ہوتی ہے اور دوسرے مرحلے پر صرف خبر کافی ہو جاتی ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس امر کی شہادت قائم ہونی چاہیئے کہ چاند ایسے چند آدمیوں نے دیکھا ہے جو بھروسے کے قابل تھے۔ کسی معتبر مجلس یا کسی مفتی یا قاضی نے یہ شہادتیں لی ہوں، ان شہادتوں کی بنا پر جب وہ مطمئن ہو کر رویتِ ہلال کا اعلان کر دے تو اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہر ایک آدمی یا تو خود چاند دیکھے یا اس کے سامنے شہادتیں پیش ہوں۔ بلکہ مجلسِ مجاز یا مفتی یا قاضی کے اعلان کی بنا پر اگر سائرن بجیں یا نقارے

---

[1] خطبہ عید الفطر صہ ۶-۵

بجیں یا شہر میں عام چرچا ہو کہ چاند دیکھا گیا تو عام لوگوں کے لیے خبر کافی ہے۔" [1]

تیسری بات یہ ہے کہ ایک آدمی کی شہادت رمضان کے چاند کے لیے ہے عید کے چاند کے لیے نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی شہادت کو رمضان کے چاند کے بارے میں قبول فرمایا ہے۔ البتہ عید کے چاند کے بارے میں فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کم از کم دو آدمیوں کی شہادت ضروری ہے۔ اس معاملے میں صرف ایک آدمی کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رمضان کے چاند کے لیے لوگوں میں وہ بیتابی نہیں ہوتی جو عید کے چاند کے لیے ہوتی ہے اس لیے اس کے معاملے میں احتیاط کا پہلو غالب رہنا چاہیئے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ شہادت دینے والے کا مومن ہونا ضروری ہے، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رویتِ ہلال کی شہادت دینے والے اعرابی کا مومن ہونا تحقیق فرمایا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دینی معاملات میں کسی غیر مومن کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ ایک غیر مومن کو اس بات کی کیا فکر ہو سکتی ہے کہ اس کی غلط گواہی سے آپ کے کسی دینی فریضے میں کوئی خرابی واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایک مومن کے لیے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آیا کل رمضان شروع ہو رہا ہے یا نہیں۔ یا کل عید ہے یا نہیں، کیونکہ اگر کل عید ہے تو روزہ رکھنا حرام ہے اور اگر عید نہیں ہے تو روزہ چھوڑنا حرام ہے۔ اور

---

[1] خطبہ عید الفطر ص۱۰۶

پھر اس صورت میں جبکہ معاملہ پوری جماعت مسلمین کے ایک دینی فریضے کا ہو وہ کیسے اتنی بڑی غیر ذمہ داری کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ غلط معلومات بہم پہنچائے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس اعرابی نے اپنے مومن ہونے کا اقرار کیا تو پھر حضورؐ نے اس کے بارے میں کوئی مزید تحقیقات نہ کی کہ آیا وہ شخص فاسق و فاجر تو نہیں ہے۔ جب اس بات کا اطمینان فرما لیا کہ وہ شخص مسلمان ہے تو پھر اس کی شہادت قبول فرمالی۔ اس سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ جب تک کسی آدمی کا فاسق ہونا معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس کی شہادت ردّ نہیں کی جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں کسی مسلمان کی شہادت اس بنا پر رد نہیں کی جائے گی کہ اس کا غیر فاسق ہونا معلوم نہیں ہوا۔ ایک مسلمان کے بارے میں ابتدائی مفروضہ یہی ہوگا کہ وہ فاسق نہیں ہے۔ اس کے غیر فاسق ہونے کی تحقیقات نہیں کرائی جائے گی۔ ہاں اگر کسی کا فاسق ہونا معلوم ہو تو پھر اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔

رویتِ ہلالِ رمضان کیلئے ایک مسلمان کی شہادت کافی ہے

۲۳۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ تَرَاءَى النَّاسُ الْهِلَالَ فَأَخْبَرْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنِّي رَأَيْتُهُ فَصَامَ وَأَمَرَ النَّاسَ بِصِيَامِهِ۔

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالدَّارِمِيُّ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کا بیان ہے کہ لوگ (اکٹھے ہو کر رمضان کا) چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پس میں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے۔ اس پر حضورؐ نے روزہ رکھنے کا فیصلہ فرمایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ رمضان کے روزے رکھنا شروع کر دیں۔

(ابو داؤد، دارمی)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے بارے میں چونکہ یہ معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور صحابی ہیں اس لیے ان سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو یا نہیں۔ بس ان کی شہادت پر رمضان کے روزوں کا فیصلہ کیا گیا۔ اس حدیث سے بھی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں رویتِ ہلالِ رمضان کے لیے ایک آدمی کی شہادت کافی ہے۔ تَرَاءَی النَّاسُ الْہِلَالَ کے الفاظ سے خود یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بہت سے لوگ چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن مطلع صاف نہ ہونے کی بنا پر چاند نظر نہیں آ رہا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو وہ نظر آگیا اس لیے انھوں نے آکر حضورؐ کے سامنے شہادت دی کہ میں نے چاند دیکھ لیا ہے، چنانچہ آپ نے اُن کی خبر پر آغازِ صوم رمضان کا فیصلہ فرمایا۔

اِس امر میں تو عام طور پر اتفاق ہے کہ ہلالِ رمضان کے لیے ایک آدمی کی شہادت بھی قابلِ قبول ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ صرف ایک آدمی کی شہادت کن حالات میں قبول کی جائے گی بعض فقہاء کے نزدیک رمضان کے چاند کے معاملے میں ایک ہی آدمی کی شہادت ہر حالت میں معتبر ہے۔ امام ابو حنیفہ بھی ایک آدمی کی شہادت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس صورت میں جبکہ مطلع صاف نہ ہو۔ اگر مطلع صاف ہو تو پھر ان کے نزدیک ایک آدمی کی شہادت کافی نہیں بلکہ اس صورت میں بہت سے لوگوں کا رویتِ ہلال کی گواہی دینا ضروری

ہے ــــ اور امام مالک اور بعض دوسرے فقہا کا یہ مسلک ہے کہ رمضان کے چاند کے لیے کم از کم دو قابلِ اعتبار آدمیوں کی شہادت ضروری ہے لیکن پیشِ نظر حدیث اُن کے مسلک کے خلاف جاتی ہے۔ البتہ بعض دوسری احادیث سے ان کے مسلک کو تقویت پہنچتی ہے، اگرچہ اُن سے بھی یہ قطعی حکم نہیں نکلتا کہ ایک آدمی کی شہادت معتبر نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضورؐ شعبان کی تاریخیں معلوم کرنے کا اہتمام فرماتے تھے

۲۴- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَفَّظُ مِنْ شَعْبَانَ مَا لَا يَتَحَفَّظُ مِنْ غَيْرِهِ ثُمَّ يَصُوْمُ لِرُؤْيَةِ رَمَضَانَ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْهِ عَدَّ ثَلَاثِيْنَ يَوْمًا ثُمَّ صَامَ۔ (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مہینوں کی بہ نسبت شعبان کی زیادہ حفاظت کرتے تھے (یعنی اس کی تاریخوں کو معلوم کرنے کا اہتمام فرماتے تھے)۔ پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھتے تھے۔ اگر مطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آتا تھا تو شعبان کے ۳۰ دن شمار کر کے روزہ رکھنا شروع کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

پہلے ایک حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا تھا کہ شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کرو، اب یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ

کا یہ عمل بیان فرمایا ہے کہ حضورؐ دوسرے مہینوں کے چاند دیکھنے اور اُن کی تاریخوں کو یاد رکھنے کا اتنا اہتمام نہیں فرماتے تھے جتنا شعبان کے معاملے میں فرماتے تھے تاکہ اس کی تاریخوں کا ٹھیک ٹھیک حساب معلوم رہے فرض کیجئے کہ بسطلع صاف نہ ہونے کی وجہ سے شعبان کا چاند رجب کی ۲۹ تاریخ کو نظر نہ آیا ہو تو مہینہ بھر کے دوران میں تحقیق کر کے اس بات کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ اس روز چاند نکلا تھا یا نہیں۔ چنانچہ حضورؐ کے زمانے میں شعبان کی تاریخیں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا جاتا تھا تاکہ ہلالِ رمضان کی تلاش کرتے وقت یہ یقینی طور پر معلوم رہے کہ آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے یا تیسؔ۔

ایک مہینے کی مُدّت دُوسرے مہینے کا ہلال نظر آنے تک ہے

۲۵۔ عَنْ اَبِی الْبَخْتَرِیِّ قَالَ خَرَجْنَا لِلْعُمْرَةِ فَلَمَّا نَزَلْنَا بِبَطْنِ نَخْلَةَ تَرَائَیْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ فَلَقِیْنَا ابْنَ عَبَّاسٍ فَقُلْنَا اِنَّا رَاَیْنَا الْهِلَالَ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ ثَلَاثٍ وَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ هُوَ ابْنُ لَیْلَتَیْنِ فَقَالَ اَیَّ لَیْلَةٍ رَاَیْتُمُوْهُ قُلْنَا لَیْلَةَ كَذَا وَكَذَا، فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَدَّهٗ لِلرُّؤْیَةِ فَهُوَ لِلَیْلَةٍ رَاَیْتُمُوْهُ ــــ وَفِیْ رِوَایَةٍ عَنْهُ ــــ قَالَ اَهْلَلْنَا رَمَضَانَ وَنَحْنُ بِذَاتِ عِرْقٍ فَاَرْسَلْنَا رَجُلًا اِلٰی ابْنِ عَبَّاسٍ یَسْئَلُهٗ، فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ قَالَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ اَمَدَّہٗ لِرُؤْیَتِہٖ فَاِنْ اُغْمِیَ عَلَیْکُمْ فَاَکْمِلُوا الْعِدَّۃَ۔
(رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابُو البختری ؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرے کے لیے (اپنے شہر سے) نکلے (راستے میں) جب ہم بطنِ نخلہ[1] کے مقام پر ٹھہرے تو ہم نے جمع ہو کر چاند دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ تیسری رات کا چاند ہے اور بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ دوسری شب کا چاند ہے۔ پھر ہم (مکّہ پہنچ کر) حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے ملے اور ہم نے اُن سے بیان کیا کہ ہم نے ہلال دیکھا ہے اور ہم میں سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ تیسری رات کا چاند تھا اور کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسری رات کا چاند تھا۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے دریافت کیا کہ تم نے کس رات کو چاند دیکھا تھا۔ ہم نے اُنھیں بتایا کہ فلاں فلاں رات کو دیکھا تھا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی مدّت (اگلے مہینے کے) چاند کی رویت تک قرار دی ہے۔ پس وہ چاند اُسی رات کا تھا جس رات تم نے اسے دیکھا تھا ——

حضرت ابوالبختری ؒ سے ایک اور روایت مروی ہے جس میں اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ ہم نے رمضان کا ہلال دیکھا جبکہ ہم ذاتِ عرق[2] کے مقام پر تھے۔ ہم نے ایک شخص

---

[1] مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام   [2] بطنِ نخلہ کے قریب ایک جگہ (مرتب)

کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس بھیجا تاکہ وہ (اختلافِ مذکور کے بارے میں) اُن سے سوال کرے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مہینے کے اِستداد کو ہلال کی رویت تک رکھا ہے۔ پس اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند تمھیں نظر نہ آئے تو پھر (مہینے کے دنوں کی) تعداد (۳۰ تک) پوری کرو۔ (مسلم)

حضرت ابوالبختریؒ ایک تابعی ہیں اور یہ واقعہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے دور کا بیان کیا ہے۔

اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے رویتِ ہلال کے بارے میں فیصلہ نہ ہو سکا ہو اور پھر اگلے روز یا اس سے اگلے روز چاند دیکھنے کے بعد لوگوں میں یہ بحث چھڑ جائے کہ آج چاند دوسری شب کا ہے یا تیسری شب کا تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کا تدارک کرنے کے لیے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی مدت کا مدار رویتِ ہلال پر رکھا ہے اور دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مہینے کے استداد کو رویتِ ہلال تک رکھا ہے۔ یعنی ایک مہینہ دوسرے مہینے کا چاند دیکھ کر ختم ہوتا ہے اور اگر ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آئے تو پھر مہینے کے دنوں کی تعداد ۳۰ تک پوری کی جائے۔ محض چاند کی لمبائی یا موٹائی کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ یہ کونسی تاریخ کا چاند ہے سراسر خود کو شک میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔ بس رویت پر اپنے فیصلے کا مدار رکھو، خواہ مخواہ کے قیاسات پر فیصلہ نہ کرو اور بلا وجہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرنے سے احتراز کرو۔

بَابٌ

اَلفَصلُ الاَوَّلُ

سحری کرنے میں برکت ہے

۲۶- عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً۔

(مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سحری کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔

(متفق علیہ)

اسلام کی مقرر کردہ عبادات اور دنیا کے دوسرے مذاہب کی عبادات میں ایک اصولی فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے ان کے فوائد میں فرق واقع ہوا ہے۔

وہ اصولی فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں عبادات کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ آدمی کا اپنے بدن کو تکلیف میں مبتلا کرنا اس کی روحانی ترقی اور اللہ سے قرب کا ذریعہ بنتا ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک بھوکا مرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور یہ آدمی کو اُس کے قریب کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے اس تصور کے مطابق متعدد ایسے ہی دوسرے کام کرتے ہیں مثلاً کوئی کسی کنوئیں کے اندر الٹا لٹک رہا ہے۔ کوئی کہیں بھٹ کے اندر زندگی گزار رہا ہے اور طرح طرح کے جانور اس کو کاٹ رہے ہیں۔ یہ اور ایسی ہی دوسری بہت سی اذیتیں تقرب خداوندی کے خواہش مند خود اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک آدمی کا اپنے جسم کو طرح طرح کی تکلیفیں دینا

اللہ تعالیٰ کو اس بات کا یقین دلانے کا ذریعہ ہے کہ یہ بندہ تیری محبت اور عشق میں ایسا مبتلا ہے کہ اپنے آپ کو مارے دے رہا ہے ——— لیکن اسلامی تصورِ عبادت کی رُو سے یہ تصوّرات سراسر جہالت پر مبنی ہیں۔

اسلامی عبادات کا مقصد ——— تربیت و تزکیۂ نفس

اس کے برعکس اسلام کی عبادات حقیقت میں آدمی کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہیں اور اس تربیت کے ذریعے سے یہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کے قریب لے جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہی روزہ ہے۔ روزے میں اصل چیز یہ نہیں ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے آپ کو بھوک پیاس میں مبتلا کیا، اور آپ کی اس تکلیف سے معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ کو کوئی خوشی ہوتی بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ آپ نے روزہ رکھ کر اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کی اطاعت کی اور اس کی فرمانبرداری کا عملی مظاہرہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ ایک خاص وقت تک تم کھا پی سکتے ہو اس کے بعد کچھ نہیں کھا سکتے تو جس وقت تک اُس نے اجازت دی آپنے اس وقت تک کھایا پیا، اس کے بعد رک گئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں اور اس کے نافرمان نہیں ہیں۔ پھر جس وقت تک وہ کہتا ہے کہ آپ نہ کھائیں، آپ نہیں کھاتے پیتے۔ چاہے بھوک اور پیاس نے آپ کو کیسا ہی نڈھال کر رکھا ہو۔ اس طرح آپ کا ایک خاص وقت تک اپنے آپ کو کھانے پینے سے روک رکھنا یہی معنی تو رکھتا ہے کہ آپ اُس کے فرمانبردار بندے ہیں۔ آپ کی یہی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور یہی فرمانبرداری درحقیقت عبادات کا حاصل ہے ورنہ محض آپ کو تکلیف دینا اللہ تعالیٰ کا مقصود نہیں ——— پھر جس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو اجازت دے دیتا ہے کہ اب تم کھاؤ پیو اس وقت اگر آپ بے نیازی برتتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم تو اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہتے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ

آپ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں یہ دعویٰ لے کر آتے ہیں کہ ہمیں تو اپنے اوپر اتنا قابو
ہے کہ (معاذ اللہ) آپ کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ دیکھئے ہم آپ کو دکھاتے
ہیں کہ ہم اپنے اُوپر کتنا قابو رکھتے ہیں ——— ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ وہ سزا
دیتا ہے جو اس نے عیسائی راہبوں کو دی۔

اسلام میں عبادات کا تصور یکسر مختلف ہے

یہاں تو یہ صورت ہے کہ جس وقت آپ کو اجازت دی گئی ہے اس وقت آپ
کا یہ فرض ہے کہ اس اجازت سے فائدہ اُٹھائیں۔ آپ کا رب اس بات سے خوش ہوتا
ہے کہ آپ اُس کی دی ہوئی اجازتوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ وہ آپ سے ناراض صرف
اُس وقت ہوتا ہے جب آپ اُن حدود سے تجاوز کریں جو اس نے مقرر کردی ہیں۔
جس جگہ اس کی طرف سے ممانعت ہے وہاں اگر آپ اس کے احکام کی خلاف ورزی
کریں تو یہ بات اس کی ناراضی کی موجب بنتی ہے لیکن یہ بات اس کی ناراضی کا
سبب نہیں بنتی کہ آپ نے اس کی اجازت کے وقت اچھا کھانا کیوں کھایا
——— اچھے کھانے بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کئے ہیں اور آپ ہی کیلئے
پیدا کیے ہیں۔ آپ اس کی نعمتوں سے متمتع ہوں تو وہ آخر آپ سے کیوں ناراض
ہوگا ——— چنانچہ جس وقت وہ کہتا ہے کہ بھوکے رہو تو اسوقت
بھوکے رہیئے اور جس وقت وہ کہتا ہے کہ کھاؤ تو اُس وقت کھایئے ———

اسی تصور سے ہمارے روزوں میں اور دوسرے مذاہب والوں کے روزوں میں
فرق واقع ہو جاتا ہے اور یہ فرق آغاز اور انجام دونوں جگہوں پر پایا جاتا ہے۔
اہلِ کتاب کے روزوں میں سحری کرنا نہیں تھا۔ ان کا روزہ سورج غروب
ہونے کے بعد شروع ہوتا تھا اور وہ رات ہی کو کھا پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔
پھر وہ روزہ دوسرے دن کے سورج کے غروب ہونے تک چلتا تھا۔ لیکن

ان کے اندر جو لوگ زیادہ "زہد و تقویٰ" برتنے والے تھے وہ دوسرے دن کا روزہ کھولتے ہی اگلا روزہ شروع کر دیتے تھے، اور کوئی اللہ کا بندہ ایسا بھی ہوتا تھا جو مثلاً مٹر کے ایک دانے سے روزہ کھول لیتا اور دوسرا روزہ شروع کر لیتا۔ پھر ان میں بعض ایسے باکمال تھے جو دوسرے دن کا روزہ بھی نہیں کھولتے تھے اور اگلا روزہ شروع کر لیتے تھے۔ اسی طرح تین تین چار چار دن کا روزہ رکھتے تھے۔ گویا جو جتنا بڑا راہب ہوتا تھا یا جس کو اپنے ذوقِ تقویٰ کا کوئی خاص بڑا کمال دکھانا ہوتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ لمبا چوڑا روزہ رکھتا تھا۔

سحری کھانے میں کیا برکت ہے

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "سحری کرو کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے" ——— سحری کھانے میں برکت یہ ہے کہ اس سے آپ کو اللہ کے حکم کی بجا آوری میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ فجر کے وقت سے روزہ شروع کرو اور غروب آفتاب کے وقت ختم کرو۔ اب جس وقت سے روزہ شروع ہوتا ہے اس سے پہلے اگر آپ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اجازت سے فائدہ اٹھا کر کھا پی لیتے ہیں تو وہ کھایا پیا دن بھر آپ کے کام آتے گا لیکن اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اس سے لازماً آپ کو کمزوری لاحق ہو گی۔ اب چونکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ روزے مہینہ بھر رکھے جائیں اور ہو سکتا ہے کہ اس طرح کسی آدمی کی طاقت اور ہمت یہ مدت پوری کرنے سے پہلے ہی جواب دے جائے اس لیے نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کرنے کی تاکید فرمائی کہ جس وقت کھانے پینے کی تمھیں اجازت ہے اس وقت تم کھاؤ پیو تاکہ جس وقت تمھیں کھانے پینے کی اجازت نہ ہو گی اس میں تمھیں اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے کی طاقت حاصل رہے۔

اہلِ کتاب اور مسلمانوں کے روزوں میں فرق

۲۷۔ عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، فَصْلُ مَا بَیْنَ صِیَامِنَا وَصِیَامِ اَھْلِ الْکِتٰبِ اَکْلَۃُ السَّحَرِ۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

"حضرت عمرو بن العاص رضؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزوں کے درمیان فرق ہے سحری کا لقمہ (یا سحری کا کھانا)" (مسلم)

چونکہ اہلِ کتاب کا روزہ سحری کے بغیر ہوتا ہے اور ہمارا روزہ سحری کے ساتھ ہوتا ہے اسلیے یہی بات ہمارے اور ان کے روزے میں فرق کرتی ہے انکا تصور یہ ہے کہ روزہ خود کو تکلیف دینے کے لیے ہے جبکہ ہمارا تصور یہ ہے کہ روزہ حکم بجالانے کی عادت ڈالنے کے لیے ہے۔ ہم فرمانبرداری کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہتے ہیں اور وہ خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے ایسی ایسی تکلیفیں اُٹھاتے ہیں جن کے اُٹھانے کا حکم خدا نے نہیں دیا ہے۔

جلدی افطار کرنے میں بھلائی ہے

۲۸۔ عَنْ سَھْلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَا عَجَّلُوا الْفِطْرَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت سہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک کہ افطار کرنے میں جلدی کرتے

رہیں گے (متفق علیہ)

یہود کا یہ دستور تھا کہ روزہ اس وقت کھولتے تھے جب آسمان پر ستارے چمک آتے تھے اور اس میں بھی جو آدمی جتنی زیادہ دیر کرتا تھا وہ اتنا ہی زیادہ متقی اور زاہد و پرہیزگار مانا جاتا تھا۔ یہ گویا اُن کے نزدیک اس بات کی علامت تھی کہ یہ شخص کھانے کے لیے مطلق بے تاب نہیں تھا اور دیکھو کیسا ضبطِ نفس ہے کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو بھی گیا ہے لیکن پھر بھی نہیں کھول رہا ہے۔ اسلام میں اس طرح کے نمائشی تقویٰ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تصوّر یہ ہے کہ جو وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اس وقت تک تو آپ اس طرح رُکے رہیں کہ جیسے کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا۔ لیکن جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت مل جائے آپ اُسی وقت اُس چیز کی طرف دوڑیں جس سے اب تک رُکے ہوئے تھے اور اس سے فائدہ اُٹھانے میں جلدی کریں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بندہ اُس کے حکم کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ اگر اس کا حکم رکنے کا نہ ہوتا تو یہ نہ رکتا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے پابند کر رکھا تھا اس لیے اس نے اپنی خواہشات اور اپنی بھوک پیاس ہر چیز پر پابندی لگا رکھی تھی لیکن جونہی اس پر سے پابندی ہٹالی گئی وہ پوری آزادی سے کھانے پینے لگا اور اپنی دوسری ضروریات پوری کرنے لگا۔ چونکہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ خیر پر رہیں گے جب تک کہ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے ــــــ اس سے یہ تنبیہ بھی مقصود تھی کہ اگر لوگوں نے افطار میں دیر لگانی شروع کر دی تو ان کو وہ بیماری لگنی شروع ہو جائے گی جس میں اہل کتاب مبتلا ہوئے۔

اسلام بُرائی کو مقامِ آغاز سے روکتا ہے

قرآن مجید اور احادیث کا گہرا مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں

اسلام کا مزاج یہ ہے اگر کوئی خطرناک چیز کافی فاصلے پر ہو تو مومن کو چاہیئے کہ اس کی جانب محض اس خیال سے نہ بڑھتا چلا جائے کہ اس کے قریب پہنچ کر تو میں رُک ہی جاؤں گا ــــــ اس کے برعکس اسلام تو خطرے کی سرحد جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں سے آپ کو روکتا ہے اور ایک قدم بھی اس کی طرف بڑھانے کو پسند نہیں کرتا۔ اب چونکہ اسلام رہبانیت کو سخت ناپسند کرتا ہے اور روزے کے معاملے میں یہ بیماری اس مقام سے لگتی ہے کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہو لیکن آپ محض اس لیے تاخیر کریں کہ اس تاخیر کے ذریعے سے جتنی زیادہ دیر آپ اپنے جسم کو تکلیف دیں گے خدا اتنا ہی زیادہ آپ سے خوش ہوگا اس لیے اس معاملے میں تنبیہ کردی گئی کہ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ چیز تمھیں خیر سے محروم کر دے گی اور اللہ کی خوشنودی کے بجائے اُلٹی اس کی ناراضی کی موجب ہو گی ۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی خوشنودی تو اس بات میں ہے کہ آپ اس کے احکام کی پیروی کریں، اس کی عاید کردہ پابندیوں کو قبول کریں اور اس کی دی ہوئی اجازتوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ جو چیز اس نے آپ کے لیے حلال کی ہے اس سے آپ پوری طرح متمتع ہوں اور جس چیز کو اُس نے حرام ٹھہرایا ہے اس سے آپ رُک جائیں اور اپنی طرف سے اس کے احکام میں کوئی کمی بیشی نہ کریں۔ یہی فرمانبرداری وہ چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ آپ پر خوش ہوتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک کہ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے افطار کا جو وقت مقرر کردیا ہے اسی پر افطار کرنا اللہ کو محبوب ہے اور اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔

روزہ کھولنے کا صحیح وقت

۲۹۔ عَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

وَسَلَّمَ: اِذَا اَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هٰهُنَا وَ اَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هٰهُنَا وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ. (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رات اس طرف سے آنی شروع ہو اور دن اس طرف سے پلٹنا شروع ہو اور سورج ڈوب جائے تو روزہ دار کے روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا۔" (متفق علیہ)

یعنی مشرق کی طرف سے اگر رات کی تاریکی بلند ہونی شروع ہو جائے اور معلوم ہو کہ تاریکی ابھرتی چلی آ رہی ہے اور دوسری طرف مغرب کی جانب یہ کیفیت ہو کہ سورج غروب ہو چکا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ دن پلٹ رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہے اور آپ کو فوراً روزہ کھول لینا چاہیے۔

اگر روزہ کھولنے کا وقت ہو گیا ہو اور اس کے بعد آپ سوچ رہے ہوں کہ روزہ کھولیں یا نہ کھولیں تو یہ بات غلط اور شریعت کی روح کے منافی ہے۔ افطار کا وقت ہوتے ہی بلا تاخیر روزہ کھولنا چاہیے۔

صومِ وصال رکھنا جائز نہیں

۳۰۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْوِصَالِ فِی الصَّوْمِ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ اِنَّكَ تُوَاصِلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَ اَیُّكُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فی الصوم سے منع فرمایا۔ اس پر ایک شخص نے حضورؐ سے عرض کیا

یارسول اللہ، آپ بھی تو وصال فی الصوم فرماتے ہیں۔ حضور نے فرمایا،
تم میں سے کون میرے مانند ہے، میں تو اس حال میں رات گزارتا ہوں کہ
میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔ (متفق علیہ)

اِس حدیث میں ایک بڑا اہم مسئلہ بیان ہوا ہے۔ اہل کتاب میں روزہ رکھنے کے جو مختلف طریقے رائج تھے ان میں سے ایک صومِ وصال کا طریقہ تھا۔ اس کی بھی مختلف شکلیں تھیں۔ ایک شکل یہ تھی کہ ایک شخص فرض روزوں کے ماسوا نفلی روزے اس طریقے سے رکھے کہ بغیر وقفہ کیے مسلسل مہینے مہینے، دو دو مہینے کے روزے رکھتا چلا جائے۔ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسا کرتے تھے اور کچھ لوگ تو ایسے بھی ہوتے تھے جو ابداً صومِ وصال رکھتے تھے۔ ــــــ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کردہ روزوں کے علاوہ باقی دنوں میں بھی وہ روزہ دار ہی رہتے تھے۔ صومِ وصال کی دوسری شکل یہ تھی کہ ایک شخص ایک سحری کھا کر دوسری سحری تک مسلسل روزہ رکھے اور درمیان میں افطار نہ کرے۔ بلکہ بعض اوقات دو دو، تین تین دن کا روزہ مسلسل رکھے۔ اہل کتاب میں صومِ وصال کی یہ دونوں شکلیں رائج تھیں ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کو روزے کے اس طریقے یعنی وصال فی الصوم سے منع فرمایا کیونکہ یہ اہل کتاب کا طریقہ تھا ــــــ البتہ اس جگہ یہ معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ جو عرض کیا گیا کہ آپ بھی تو صومِ وصال رکھتے ہیں تو یہاں حضورؐ کے صومِ وصال سے کیا مراد ہے۔ آیا آپؐ ایک سحری سے دوسری سحری تک روزہ رکھتے تھے یا طویل عرصے تک مسلسل روزے رکھتے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ حضورؐ ایک سحری سے دوسری سحری تک کا روزہ نہیں رکھتے تھے بلکہ مسلسل نفل روزے رکھتے تھے۔ البتہ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ آپ ایک مدت تک روزے نہیں بھی رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود صومِ وصال رکھنا آپ کی ان خصوصیات میں

سے ہے جن کی تقلید دوسرے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں، کیونکہ حضورؐ نے خود اس بات کی وضاحت فرمادی کہ تم میں سے کوئی میرے جیسا نہیں ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

روزے کی نیت کرنا ضروری ہے

۳۱- عَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ لَّمْ يُجْمِعِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاوُدَ وَالنَّسَائِيُّ وَالدَّارِمِيُّ)

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے فجر سے پہلے روزہ رکھنے کا فیصلہ نہ کرلیا اس کا کوئی روزہ نہیں۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی)

اس ارشاد سے مقصود یہ ہے کہ جب آپ کسی عبادت کا آغاز کرنے لگیں تو اس وقت یہ نیت کریں کہ میں یہ عبادت اللہ کیلئے کر رہا ہوں۔ یہ بات اسلیے ارشاد فرمائی کہ آدمی کھانا پینا تو فاقے میں بھی نہیں لیکن جو چیز روزے اور فاقے میں فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ روزہ رکھتے وقت آپ اس بات کی نیت کرتے ہیں کہ میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طور پر کھانا پینا ترک کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے یہ نیت نہ کی تو بظاہر روزے اور فاقے میں کوئی فرق نہ رہا۔

روزے کا آغاز چونکہ فجر سے ہوتا ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فجر کے وقت سے پہلے یہ عزم کرلو کہ تم اللہ کے لیے روزہ رکھ رہے ہو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے روزے اور فاقے میں کوئی امتیاز قائم نہیں کیا۔

تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر ایک آدمی فجر سے پہلے روزے کی

نیت کرنا بھول گیا تو اس کا روزہ ہی ساقط ہو گیا اور اسے بعد میں اس کی قضا ادا
کرنا ہو گی ۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اگر آپ روزہ رکھتے وقت یہ نیت کرنی بھول گئے ہوں
تو جس وقت آپ کو یاد آئے اُسی وقت روزے کی نیت کر لیں، ورنہ یہ بات اپنی جگہ پہ
تو واضح ہے کہ آپ کی نیت روزے کی موجود ہے ۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ سحری
کے لیے اُٹھے تھے تو یہ سمجھتے ہوئے ہی تو اُٹھے تھے کہ آپ کو روزہ رکھنا ہے ۔ اس
لیے اگر روزہ رکھتے وقت آپ یہ الفاظ زبان سے ادا نہیں کر سکے کہ میں آج اللہ
کے لیے روزہ رکھ رہا ہوں یا دل میں اس کا خیال عین آغازِ صوم کے وقت
نہیں آیا تو اس سے روزہ باطل نہیں ہو جاتا ــــــــــــ البتہ یہ بات یاد رکھنی
چاہیے کہ شریعت میں چونکہ اصل اہمیت نیت کو حاصل ہے اور اعمال کی قدر و قیمت
بھی نیت ہی کی بنا پر متعین ہوتی ہے اس لیے شریعت کی نظر میں ایک فعل کو
دوسرے فعل سے ممتاز کرنے والی چیز آدمی کی نیت ہے ۔ اسی وجہ سے ارشاد فرمایا
کہ فجر سے پہلے آدمی کو چاہیے کہ وہ بالارادہ اس بات کی نیت کرے کہ میں آج روزہ
رکھ رہا ہوں ۔ ورنہ اس کے بغیر محض ظاہری فعل کی حد تک روزے اور فاقے میں
کوئی فرق نہیں رہتا ۔

سحری کے وقت میں گنجائش ہوتی ہے

۲۲ ۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ
وَسَلَّمَ : اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ اَحَدُکُمْ وَالْاِنَاءُ فِیْ یَدِهٖ فَلَا
یَضَعْهُ حَتّٰی یَقْضِیَ حَاجَتَهٗ مِنْهُ ۔ (رواہ ابوداؤد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ، جب تم میں سے کوئی شخص اذان کی آواز سنے اور اس وقت

برتن ابھی اس کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس برتن کو اپنے ہاتھ سے نہ رکھے جب تک کہ اپنی حاجت اس سے پوری نہ کر لے۔ (ابوداؤد)

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سحری کے وقت نقارے اور سائرن نہیں بجتے تھے بلکہ لوگوں کو اذان کے ذریعے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ گرمی کا زمانہ ہے اور لوگ باہر کھلی جگہ میں سو رہے ہیں تو اس حالت میں ہر شخص خود یہ دیکھ سکتا تھا کہ روزہ شروع ہونے کا وقت ہو گیا ہے یا نہیں ——— اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بارش اور جاڑے کا زمانہ ہے اور لوگ گھروں کے اندر سحری کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں تھا کہ سب لوگ باہر نکل کر دیکھیں کہ سحری کا وقت ختم ہو گیا ہے یا نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ جب سحری کے وقت اذان کی آواز تمہارے کان میں پڑے اور صورت یہ ہو کہ ایک آدمی پانی پی رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں برتن ہے تو ضروری نہیں کہ اللہ اکبر کی آواز سنتے ہی وہ اسے رکھ دے بلکہ اسے اجازت ہے کہ وہ اس میں سے اپنی ضرورت پوری کر لے۔

قرآن مجید اور احادیث میں سحری کے خاتمے کے وقت کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے اور عام مشاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سیکنڈوں کے حساب سے نہیں ہے کہ ایک سیکنڈ ادھر تو سحری کا وقت ہو اور ایک سیکنڈ اُدھر جاتے ہی سحری کا وقت ختم ہو جائے۔ ختم سحر اور طلوع فجر در اصل ایک بڑا مظہر فطرت ہے جسے آدمی مشرق کی طرف دیکھتا ہے۔ مشرق سے سپیدی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آغاز میں ایک ہلکی سی دھاری نمودار ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اب گویا فجر کا آغاز ہو رہا ہے اور رات ختم ہو رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ طلوع فجر (Dawn) کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو سیکنڈوں کے حساب سے

ہو بلکہ وداعِ شب اور طلوعِ فجر میں چند منٹ کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ جب آدمی اذان کی آواز سنتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس سے ایک سیکنڈ پہلے تک تو سحری کا وقت تھا لیکن موذن کی زبان سے اَللہ کا لفظ نکلتے ہی یہ وقت ختم ہوگیا۔ اس طرح کی موشگافیاں کرنا درست نہیں سیدھی بات یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کبھی ایسا ہو کہ آپ سوتے رہ گئے اور آنکھ کھلنے پر آپ نے ابھی چند لقمے ہی لیے تھے کہ سائرن بج گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ فوراً ہاتھ روک لیں یا برتن اپنے منہ سے ہٹا لیں بلکہ جلدی جلدی تھوڑا بہت جو کچھ بھی آپ کھا پی سکتے ہیں آپ کو کھا لینا چاہیئے۔

اس حدیث میں یہی بات فرمائی گئی ہے کہ جب تم اذان کی آواز سنو یا سحری کے خاتمے کا کوئی دوسرا اعلان ہو رہا ہو اور اس وقت تمہارے ہاتھ میں کوئی برتن ہو تو اسے رکھ مت دو بلکہ اس سے اپنی حاجت پوری کر لو۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اس اجازت سے فائدہ اُٹھا کر اطمینان سے بیٹھا کھاتا رہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ جلدی سے اپنی ضرورت پوری کر لینی چاہیئے۔

افطار میں جلدی کرنے والے اللہ کو محبوب ہیں

۲۲۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُهُمْ فِطْرًا۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ مجھے اپنے بندوں میں

سے سب سے زیادہ پسندوہ ہیں جو افطار میں جلدی کرنے والے ہیں۔

(ترمذی)

افطار کے لیے افضل چیزیں

۲۴۔ عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: اِذَا اَفْطَرَ اَحَدُکُمْ فَلْیُفْطِرْ عَلٰی تَمْرٍ فَاِنَّہٗ بَرَکَۃٌ، فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ فَلْیُفْطِرْ عَلٰی مَاءٍ فَاِنَّہٗ طَھُوْرٌ۔ (رَوَاہُ اَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَہ وَالدَّارِمِیُّ)

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی شخص افطار کرے تو اُسے چاہیئے کہ کھجور سے افطار کرے کیونکہ اس میں برکت ہے، اور اگر کھجور نہ پائے تو اُسے چاہیئے کہ پانی سے افطار کرے کیونکہ وہ پاک ہے۔

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

۲۵۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُفْطِرُ قَبْلَ اَنْ یُّصَلِّیَ عَلٰی رُطَبَاتٍ، فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَیْرَاتٌ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تُمَیْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ۔ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ آپؐ (مغرب کی) نماز پڑھنے سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے روزہ کھولتے۔ اگر تازہ کھجوریں نہ ملتیں تو چھوہاروں سے افطار کرتے

اور اگر چھوہارے بھی نہ ملتے تو چند گھونٹ پانی کے نوش فرمالیے۔ (زندی داود)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ آپ پہلے روزہ افطار کرتے تھے اور پھر نماز پڑھتے تھے۔ افطار میں آپ کا دستور یہ تھا کہ آپ تازہ کھجور سے افطار کرتے (تازہ کھجور سے یہ مراد نہیں کہ ابھی درخت سے اتری ہو بلکہ وہ کھجور مراد ہے جو خشک نہ ہو یعنی تر کھجور) جیسے ہم یہاں کھجور استعمال کرتے ہیں ـــــ اگر کھجور نہ ملتی تو پھر آپ چھوہاروں سے روزہ کھولتے تھے اور اگر کبھی اتفاق سے وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے ایک دو گھونٹ پی کر روزہ افطار فرماتے۔

روزہ افطار کرانے والے کا اجر

۳۶- عَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا اَوْ جَھَّزَ غَازِیًا فَلَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ

(رَوَاہُ الْبَیْہَقِیُّ وَمُحْیِ السُّنَّۃِ)

حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص کسی روزہ دار کا روزہ کھلوائے یا کسی غازی کیلئے سامانِ (جہاد) فراہم کر کے دے تو اس کو ویسا ہی اجر ملے گا جیسا کہ اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا اور غازی کو جہاد کرنے کا ملے گا۔ (بیہقی، محی السنۃ)

شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ نیکی کرنے والے کے لیے تو اس کی نیکی کا اجر ہے ہی لیکن جو اس کو نیکی کے ذرائع فراہم کر کے دے اس کے لیے بھی اجر ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی کو نیکی کرنے کے لیے کہے تو اس کے لیے بھی اجر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ (نیکی کی طرف رہنمائی کرنے والا اس نیکی کے کرنے والے کے مانند ہے۔) ـــــ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ نیکی کرنے والے کے اجر میں سے

کر تی حصہ لے کر اس شخص کو دے دیا جائے گا جس نے نیکی کے ذرائع اور وسائل بہم پہنچائے تھے بلکہ نیکی کرنے والے کو اس کا پورا اجر ملے گا اور اس نیکی کے لیے سفارش کرنے والے اور اس میں مددگار بننے والے کو بھی اپنا اپنا اجر ملے گا۔

کسی روزہ دار کا روزہ کھلوا دینا بظاہر معمولی سی بات ہے لیکن اس کا جو اجر ارشاد فرمایا گیا وہ کہیں بڑا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ محض نیکی کی طرف رغبت دلانا بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں بڑا محبوب فعل ہے کیونکہ اس سے نیکیوں کے پھیلنے میں مدد ملتی ہے اور انسانی خیر و فلاح کا وہ کام انجام پاتا ہے جو دین کا مقصود ہے۔

افطار کے وقت کی مسنون دُعائیں

۲۷۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَفْطَرَ قَالَ: ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قاعدہ تھا کہ جب آپ روزہ افطار کرتے تو فرماتے کہ تشنگی دور ہوگئی اور رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا، اگر اللہ چاہے۔ (ابوداؤد)

روزہ کھولتے وقت جو مختلف دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے۔ یعنی حضورؐ روزہ کھولتے وقت یہ الفاظ ادا فرمایا کرتے تھے۔

۲۸۔ عَنْ مُعَاذِ بْنِ زُهْرَةَ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَفْطَرَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ

وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ۔ رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ مُرْسَلاً

حضرت معاذ بن زہرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب روزہ افطار کرتے تھے تو فرماتے تھے، اے اللہ! تیرے ہی لیے میں نے روزہ رکھا، اور تیرے ہی رزق پر میں نے افطار کیا۔

(ابوداؤد)

اگر ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ کوئی فریضہ انجام دیتا ہے تو اس کا یہ فعل بذاتِ خود اپنی ایک قدر و قیمت رکھتا ہے اور اس پر وہ اجر کا مستحق ہے لیکن اس فریضے کی انجام دہی کے دوران میں اس کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ غفلت کے ساتھ اسے انجام دے اور دوسری یہ کہ وہ اس کے دوران میں مسلسل اپنے رب کی طرف راغب رہے اور اس کا ذکر کرتا رہے۔ ان دونوں حالتوں میں اجر اور مقبولیت کے لحاظ سے بڑا فرق ہے ___ ایک شخص کا کسی فریضے کی انجام دہی کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی طرف اہتمام کے ساتھ متوجہ رہنا اس کے اجر کو کہیں زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ آپ نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور آپ نے وہ سارے اعضاء ٹھیک ٹھیک دھوئے ہیں جو وضو میں دھونے چاہئیں۔ اسطرح بیشک آپ نماز میں کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ لیکن اگر اس وضو کے دوران میں آپ مختلف اعضاء دھونے کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر بھی کرتے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے یہ وضو اللہ سے غفلت کی حالت میں نہیں کیا اس لیے آپ کے اس وضو کی قدر و قیمت ہی کچھ اور ہو گئی۔

یہی مثال روزے کی ہے۔ اگر آپ سحری کا وقت ختم ہونے سے لے کر افطار کے وقت تک کچھ کھائیں پئیں نہیں تو آپ کا روزہ مکمل ہو جائے گا۔ لیکن اس روزے کے دوران میں اگر آپ خدا کو یاد بھی کرتے رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ

نے اس روزے کے اجر اور قدر و قیمت کو بہت زیادہ بڑھا لیا۔ دوسرے الفاظ میں روزے کے دوران میں غفلت کے ساتھ وقت گزارنے اور اس کے برعکس اللہ کو یاد کرتے ہوتے وقت گزارنے میں اجر و مقبولیت کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے —— پھر دیکھئے کہ جب روزہ ختم ہو جاتا ہے تو آپ کو حق پہنچتا ہے کہ آپ فوراً ایک کھجور یا افطاری کی کوئی چیز اٹھائیں اور کھالیں۔ لیکن افطار کرتے وقت بھی اگر آپ اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہے ہیں اور اس سے پہلے کہ آپ اپنے منہ میں کوئی چیز رکھیں آپ کہتے ہیں کہ خدایا تیرے ہی لیے میں نے روزہ رکھا اور تیرے ہی دیتے ہوتے رزق پر یہ روزہ افطار کر رہا ہوں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے غفلت کی حالت میں بھوکے پیاسے نہیں رہے اور نہ روزہ افطار کرتے وقت ہی اس کی یاد سے غافل ہو گئے۔ بلکہ ہر لحظہ آپ نے اس کی یاد کو تازہ رکھا۔ اس طرح گویا آپ نے اپنے اس روزے کے اجر کو کئی گنا زیادہ بڑھا لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طریقہ بھی یہی تھا اور اسی کی آپ نے لوگوں کو تعلیم دی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ایک عبادت کرتے ہوتے دوسری عبادتیں بھی ساتھ ساتھ شامل ہو جائیں تو خود اس عبادت کی قدر و قیمت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

افطار میں تاخیر کرنا یہود و نصاریٰ کی روش ہے

۲۹۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لَا یَزَالُ الدِّیْنُ ظَاهِرًا مَا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ لِاَنَّ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی یُؤَخِّرُوْنَ۔

(رَوَاهُ اَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : یہ دین نمایاں اور غالب رہے گا جب تک کہ لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے کیونکہ یہود اور نصاریٰ افطار کرنے میں تاخیر کرتے ہیں۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بظاہر ایک چھوٹی سی بات کے کتنے بڑے نتائج بیان فرمائے ہیں۔

روزہ کھولنے میں تاخیر کرنا اور سحری نہ کھانا اور صومِ وصال رکھنا، یہ سب افعال یہود و نصاریٰ نے اپنا رکھے تھے ــــــ یہی چیز تھی جس نے رفتہ رفتہ اُن کے اندر رہبانیت پیدا کی اور انھیں زندگی سے فرار کر کے گوشوں میں پناہ لینے کی طرف راغب کیا۔ لیکن دینِ خداوندی کا منشا اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ کے دین کا منشا یہ ہے کہ یہ دنیا انسانوں ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اس کی لذتیں اور آسائشیں اور دوسرے سروسامان انسانوں ہی کے لیے ہیں۔ البتہ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان ساری چیزوں کو اللہ کے مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرے اور ان حدود سے سرِمُو انحراف اور تجاوز نہ کرے ــــــ پس ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ شریعت نے اس کو جو سہولت اور گنجائش دی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے۔ البتہ اس سُہولت کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس پر جا کر رُک جائے۔ سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد تو یہ پابندی ہے کہ جب تک سورج غروب نہ ہو جائے تم کچھ کھانے پینے کا حق نہیں رکھتے لیکن سورج ڈوبتے ہی تمھیں حق پہنچتا ہے کہ کھاؤ پیو۔ اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ روزہ افطار کرنے میں یہود اور نصاریٰ کا تاخیر کرنا دراصل رہبانیت کا ایک شاخسانہ تھا اور اپنے رب سے بدگمانی اس کی جڑ تھی۔ ان کا تصور یہ تھا کہ ان کا رب اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اپنے

جسم کو اذیتوں میں مبتلا کیا جائے لیکن یہاں تصور یہ ہے کہ آپ کے رب کو آپ کی اطاعت و فرمانبرداری مطلوب ہے اور اس کو وہ پسند کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اگر ایک وقت میں پانی جیسی حلال چیز آپ کے لیے حرام کر دیتا ہے تو آپ کا کام یہ ہے کہ اس کے استعمال سے رُک جائیں۔ لیکن جس وقت وہ اسے آپ کے لیے حلال کر دے تو آپ فوراً اس سے فائدہ اُٹھائیں ——— اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم یہود اور نصاریٰ کے اس طریقے کے خلاف افطار میں جلدی کرتے رہو گے تمھارا دین غالب اور نمایاں رہے گا، لیکن جس وقت تم نے اس میں تاخیر کرنی شروع کر دی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب تم نے دین کی اصل اسپرٹ کو ضائع کر دیا، اور اب چلے تم سیدھے رہبانیت کی طرف۔ اس طرح جب تم نے اپنا طریقہ چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کے طرزِ عمل کو اختیار کر لیا تو اس کے بعد تمھارا دین غالب کیسے رہ سکتا ہے۔ ایک مسلمان کا کام تو یہ ہے کہ جس چیز میں یہود و نصاریٰ کے اخلاق و عادات اور تہذیب و تمدن کی تقلید کا شائبہ بھی موجود ہو اس سے کھٹک جائے اور اس سے بچے کیونکہ ان کی تقلید اختیار کرنا خود اپنے دین کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمھارا دین اپنی اصلی شان کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پہلے ایک چیز کی تقلید کرو گے اور پھر دوسری کی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو جائے گی کہ تمھارے اندر ایک سچے مسلمان کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ جس مقام سے بگاڑ کا آغاز ہوتا ہے وہیں پر رُک جاؤ، کیونکہ اگر اس مقام پر نہ رُکے تو پھر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاؤ گے۔

——— اور اسی بنا پر اتنی بڑی بات فرمائی ہے کہ تمھارا دین غالب اور نمایاں رہے گا اگر تم یہود اور نصاریٰ کی روش کے برعکس افطار کرنے میں جلدی کرتے رہے۔

روزہ کھولنے اور نماز پڑھنے میں جلدی کرنا مسنون ہے

۴۰- عَنْ اَبِیْ عَطِیَّةَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَمَسْرُوْقٌ عَلٰی عَائِشَةَ فَقُلْنَا یَا اُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ رَجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَدُهُمَا یُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَیُعَجِّلُ الصَّلٰوةَ وَالْاٰخَرُ یُؤَخِّرُ الْاِفْطَارَ وَیُؤَخِّرُ الصَّلٰوةَ قَالَتْ اَیُّهُمَا یُعَجِّلُ الْاِفْطَارَ وَیُعَجِّلُ الصَّلٰوةَ قُلْنَا عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ هٰکَذَا اصْنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالْاٰخَرُ اَبُوْمُوْسٰی - (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابو عطیہؒ بیان کرتے ہیں کہ میں اور مسروقؒ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور ہم نے عرض کیا: اے اُمّ المومنین رضؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے دو صاحب ایسے ہیں کہ ان میں سے ایک تو افطار کرنے اور نماز پڑھنے میں جلدی کرتے ہیں اور دوسرے افطار اور نماز دونوں میں تاخیر کرتے ہیں۔ اُمّ المومنین رضؓ نے دریافت فرمایا کون صاحب ہیں جو افطار اور نماز میں جلدی کرتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا، عبداللہ بن مسعودؓ۔ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے ـــــــ دوسرے صاحب حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ ہیں۔ (مسلم)

یہاں پہلے تاخیر اور تعجیل (جلدی کرنے) کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تعجیل کرنے سے مراد اُن کا یہ عمل تھا کہ ادھر روزہ افطار کرنے کا وقت ہوا اور اُدھر آپ نے روزہ افطار کیا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا طریقہ یہ تھا کہ افطار کا وقت ہو جانے کے بعد قدرے تامّل کرتے تھے کیونکہ افطار کے وقت کا ٹھیک ٹھیک تعین ہونے اور اس کا اطمینان حاصل کرنے کیلئے کچھ توقف کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ جب آفتاب غروب ہوتا ہے تو اس وقت اگر ذرا سی کرن بھی نظر آرہی ہو تو آپ اس میں شبہ کرتے ہیں کہ کیا واقعی سورج غروب ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس بات کا یقین حاصل کرنے کے لیے چند لمحے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔

پہلے صاحب یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تو غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روزہ کھولتے تھے اور نماز میں بھی جلدی کرتے تھے۔ لیکن حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روزہ کھولنے میں بھی قدرے تاخیر کرتے تھے اور نماز سے پہلے بھی کچھ دیر ٹھہرتے تھے (اور کچھ نہ کچھ کھا پی لیتے تھے)۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کے روزہ کھولنے کا انتظار کرتے تھے تاکہ وہ بھی اطمینان سے روزہ افطار کر کے نماز میں شریک ہو جائیں۔

اِس تعجیل اور تاخیر کے معاملے میں ایک یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں عام لوگوں کے لیے کچھ سہولت اور کچھ دقت کے پہلو ہیں۔ مثلاً افطار کے بعد مسجد میں نماز جلدی ہونے کی صورت میں دیر سے آنے والوں کو دقت ہوتی ہے، لیکن جو لوگ افطار کے وقت موجود ہوتے ہیں انھیں انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑتی ہے۔ تاہم اس معاملے میں حضرت عائشہؓ کے ارشاد کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ آپ افطار میں بھی

جلدی کرتے تھے اور نماز میں بھی ——— حضرت عائشہؓ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے ان دونوں صاحبوں میں سے ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط قرار دیا ہے بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل کیا تھا اور اس میں مسنون طریقہ کیا ہے ——— اس لیے یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے طریقے کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے عمل کی گنجائش بھی شریعت میں موجود ہے کیونکہ وہ جس تاخیر سے کام لیتے تھے وہ یہود والی تاخیر نہیں تھی۔ روزہ افطار کرنے سے پہلے غروبِ آفتاب کا اطمینان کرنے کے لیے کچھ توقّف کرنے کی گنجائش بالکل قابلِ فہم ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ اس کا محرّک جان بوجھ کر تاخیر کرنے یا راہبانہ احتیاط پسندی کا جذبہ نہ ہو۔

سحری کا کھانا ایک مبارک ناشتہ ہے

۴۱۔ عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ دَعَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى السَّحُوْرِ فِيْ رَمَضَانَ فَقَالَ: هَلُمَّ اِلَى الْغَدَاءِ الْمُبَارَكِ۔

(رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے ساتھ سحری کھانے کے لیے بلایا اور فرمایا کہ آؤ مبارک ناشتے کیلئے۔

(ابوداؤد، نسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشادِ گرامی کے مطابق سحری فقط سحری

نہیں ہے بلکہ ایک مبارک ناشتہ ہے۔

یہود یہ سمجھتے تھے کہ اگر سحری کھا کر روزہ رکھا تو کیا رکھا لیکن اسلامی شریعت میں اس تصور کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے کہ روزہ صرف دن کا ہے اور رات اس میں شامل نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ رات کو کھانے پینے کی مکمل آزادی ہے اور اس آزادی سے خود کو محروم کرنا درست نہیں۔ رات کو اُٹھ کر سحری کھانا تو ایک مبارک ناشتہ ہے جس کے ساتھ ہم روزے کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ روزہ شروع ہونے سے پہلے کچھ غذا کھا لی جائے تاکہ دن بھر کام کاج کرنے اور دوسرے ضروری اُمور سرانجام دینے کی طاقت ہمیں حاصل رہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر بیکار پڑ جائیں۔ یہ دین کا مقصود نہیں ہے۔

دین کا مقصود تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی بھی کریں اور ہمارے اندر کام کرنے کی طاقت بھی رہے تاکہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فرائض اور ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ہم انہیں بتمام و کمال ادا کر سکیں۔ عبادت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ آپ کاروبارِ دنیا سے کٹ کر اور ناکارہ ہو کر الگ گوشوں میں جا بیٹھیں بلکہ عبادت تو درحقیقت اس بات کا ایک تربیتی کورس ہے کہ آپ ہنگامہ زارِ حیات میں اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی پابندی کرتے ہوئے کس طرح زندگی گزاریں تاکہ آخرت میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

بہترین سحری کھجور ہے

۴۲۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ

عَلَیہِ وَسَلَّمَ: نِعْمَ سَحُوْرُ الْمُؤْمِنِ التَّمْرُ۔

(رَوَاہُ اَبُوْدَاؤْدَ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کے لیے بہترین سحری کھجور ہے۔ (ابو داؤد)

کھجور میں انسان کی تمام غذائی ضروریات پوری کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اگر انسان کو کوئی اور غذا نہ مل سکے لیکن کھجور حاصل ہو تو یہ اس کے لیے کافی غذا ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق انسان کو اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے غذا کی جتنی کلوریاں درکار ہوتی ہیں وہ کھجور میں موجود ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں بھی جب فوجوں کو کسی صحرائی علاقے میں لمبے عرصے کے لیے قیام کرنا پڑتا ہے اور وہاں غذا مہیا کرنے کے عام مواقع موجود نہیں ہوتے تو کھجوروں کا کافی سٹاک فوج کے لیے فراہم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر کئی کئی ماہ تک کوئی اور غذا میسر نہ آئے تو محض کھجور پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

کھجور کی اسی افادیت اور بھرپور غذائیت کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بہترین سحری قرار دیا ہے۔ سحری کے طور پر اس کے استعمال کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ یہ دن کے وقت آدمی کو اپنی طاقت و توانائی برقرار رکھنے اور کام کاج کے قابل رکھنے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

بَابُ تَنزِیْہِ الصَّوْم

اِس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ روزے کو کن کن چیزوں سے محفوظ رکھنا چاہیئے اور روزے کو پاک اور درست رکھنے کے لیے کیا احتیاطیں ضروری ہیں۔ مزید برآں کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کا کرنا روزے کی حالت میں جائز ہے اور ان سے روزے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی۔

اِن احادیث کی تشریح و توضیح سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے تاکہ ان کے مطالعہ کے دوران میں کسی طرح کی خلش یا شبہات پیدا نہ ہوں۔

یہ بات کہ کن چیزوں سے روزے میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور کن چیزوں سے نہیں ہوتی اور کیا کام ایسے ہیں جن کے کرنے کی اجازت ہے اور کیا کام ایسے ہیں جن کے کرنے کی اجازت نہیں ہے اس کے بیان میں بعض بڑے نازک مسائل بھی آتے ہیں۔ خصوصاً وہ مسائل جو آدمی کی خلوت کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آدمی کی زندگی کا ایک ایسا لازمی حصہ ہیں جس سے کوئی انسان بھی بری نہیں ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ روزے کی حالت میں انسان اپنی اس زندگی میں کہاں تک جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر وضاحت کے ساتھ اس کا جواب نہ دیا جاتا تو آدمی ہر وقت ایک خلجان اور پریشانی میں مبتلا رہتا۔ علاوہ بریں اس غرض کے لیے یہ بھی ناگزیر تھا کہ اس سلسلے کی ضروری معلومات اور رہنمائی وہ ہستیاں فراہم کریں جن کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت کی زندگی سے واقفیت حاصل تھی، یعنی ازواج مطہرات رض۔
طالبانِ رشد و ہدایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ حضورؐ کی اندرونِ
خانہ کی زندگی کے متعلق ضروری معلومات اور رہنمائی ازواجِ مطہرات رض سے حاصل کریں
اور ازواجِ مطہرات رض کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ یہ ضروری معلومات
اور ہدایات ان کو بہم پہنچائیں کیونکہ وہ اس ہستی کی بیویاں تھیں جس کو اللہ تعالیٰ نے
انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیدا کیا تھا اور جس کی زندگی کو انسانیت کیلئے
کامل نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایک اہم سبب تھا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ازواجِ
مطہرات کو اُمت کی مائیں (امہات المومنین) قرار دیا تاکہ ان کی اس نازک حیثیت
کے مطابق ان کا ضروری ادب و احترام ملحوظ و برقرار رہے اور اُمت کو یہ بتا دیا
گیا کہ اگر ان کے متعلق تم دل میں بھی کوئی بُرا خیال لاؤ گے تو تمہارا ایمان ختم ہو جائے گا۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

روزے سے مقصود تقویٰ ہے نہ کہ فاقہ کشی

۴۳۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَیْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِیْ اَنْ یَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ (رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ)

حضرت ابوہریرہ رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا: اگر کسی شخص نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا چھوڑا
تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔ (بخاری)

مراد یہ ہے کہ جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا
نہیں چھوڑتا وہ محض فاقہ کرتا ہے اور اس کا روزہ بے معنی ہے کیونکہ روزے سے

جو تقویٰ، پرہیزگاری اور خدا خوفی پیدا کرنا مقصود تھا وہ تو اس نے اپنے اندر پیدا ہی نہیں ہونے دی۔

جھوٹ پر عمل کرنے سے کیا مراد ہے؟

جھوٹ بولنے کا مطلب تو واضح ہے البتہ جھوٹ پر عمل کرنے کا مفہوم سمجھ لینا چاہیئے۔

جھوٹ بولنا تو ایک حد تک محدود چیز ہے لیکن جھوٹ پر عمل کرنا قریب قریب سارے گناہوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

اِس بات پر غور کیجئے کہ اگر ایک آدمی نے دوسرے کا مال ناحق ہتھیا لیا ہو تو اس نے درحقیقت ایک جھوٹ پر عمل کیا ہے۔ مال اس کا نہیں تھا لیکن اس نے اسے اپنا سمجھ کر یا اپنا قرار دے کر یا یہ فیصلہ کر کے کہ اب یہ میرا ہونا چاہیئے اس پر قبضہ کر لیا تو اس کی یہ چوری دراصل ایک جھوٹ ہے جس پر اس نے عمل کیا۔

اِسی طرح جو آدمی کسی کو قتل کرتا ہے وہ اصل میں جھوٹ پر عمل کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس بات کا حق دار فرض کر لیتا ہے کہ چونکہ فلاں شخص نے میرا قصور کیا ہے اس لیے میں اسے قتل کر سکتا ہوں درآنحالیکہ اُسے اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اِس طرح درحقیقت وہ جھوٹ پر عمل کرتا ہے۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک آدمی جتنے گناہ بھی کرتا ہے خواہ وہ براہِ راست خدا کی نافرمانی کے گناہ ہوں یا بندوں پر ظلم و زیادتی کے گناہ ہوں۔ دونوں شکلوں میں درحقیقت ہر گناہ ایک جھوٹ ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی آدمی نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس بات کی کوئی حاجت نہیں کہ اس کا کھانا پینا چھڑوا دے کیونکہ اس نے روزے کے اصل مقصد کو فوت کر دیا۔

البتہ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ جھوٹ نواقضِ صوم (یعنی روزہ توڑنے

والی چیزوں) میں سے نہیں ہے ایک چیز تو وہ ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری چیز وہ ہے جس سے روزے کے حسن و خوبی (Quality) میں خرابی واقع ہوتی ہے مثلاً وہ اخلاقی برائیاں ہیں جن کے ارتکاب سے روزے کی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی لیکن ان سے روزہ ٹوٹتا نہیں۔ یہاں یہ فرمایا کہ اللہ کو اس کے روزے کی کوئی حاجت نہیں، یہ نہیں فرمایا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔ مدعا یہ ہے کہ اس نے روزے کے مقصد کو فوت کر دیا اور اس کے روزے کی رُوح ختم ہو گئی کیونکہ اس نے روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا۔

روزے کی حالت میں بیوی سے میل جول کے حدود

۴۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَبِّلُ وَيُبَاشِرُ وَهُوَ صَائِمٌ وَكَانَ أَمْلَكَكُمْ لِإِرْبِهِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بیوی سے اختلاط (میل جول) کر لیا کرتے تھے، اور حضورؐ تم سب سے بڑھ کر اپنی خواہشات پر قابو رکھنے والے تھے۔ (متفق علیہ)

مراد یہ ہے کہ روزے میں جنسی عمل کے ماسوا باقی ہر طرح کا میل جول اور اختلاط جائز ہے۔ یہ تو ہے اصل قانون، البتہ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ اس اجازت سے کس قسم کے آدمی کے لیے فائدہ اُٹھانا درست ہے یعنی اگرچہ اصل جنسی عمل کے سوا اختلاط کی تمام شکلیں جائز ہیں لیکن اس میں یہ خطرہ موجود ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور ایسا فعل

کر بیٹھے جس سے روزہ ٹوٹ جائے۔ اس لیے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ
حضورؐ تم سب سے بڑھ کر اپنی خواہشات پر قابو رکھنے والے تھے مراد یہ ہے کہ
اگر تم میں سے کسی شخص کو اپنی ذات پر پورا قابو ہو تو وہ اس اجازت سے فائدہ اٹھا
سکتا ہے۔ لیکن جس شخص کو اتنا قابو نہ ہو اس کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے۔
آگے ایک حدیث میں اس کی وضاحت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ایک اور قول سے بھی ملتی ہے۔ اس کی وضاحت اپنے موقع پر آئے گی۔

حالتِ جنابت میں روزہ شروع کیا جا سکتا ہے

۴۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُدْرِكُهُ الْفَجْرُ فِيْ رَمَضَانَ وَهُوَ جُنُبٌ مِنْ غَيْرِ حُلْمٍ فَيَغْتَسِلُ وَيَصُوْمُ۔
(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رمضان میں رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر بعض اوقات فجر ایسی حالت میں آجاتی تھی کہ آپ حالتِ جنابت
میں ہوتے تھے اور وہ جنابت ایسی نہیں ہوتی تھی جو خواب کی وجہ سے
ہوتی ہے۔ پھر آپ غسل فرمالیتے تھے اور اس وقت آپ روزے سے
ہوتے تھے۔ (متفق علیہ)

رمضان کے زمانے میں بعض اوقات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کو رات
کے وقت جنابت لاحق ہو تو کیا اس کے لیے یہ لازم ہے کہ سحری بند ہونے اور
روزہ شروع ہونے سے پہلے پہلے نہالے یا اس بات کی اجازت ہے کہ وہ سحری
کا وقت ختم ہونے اور روزہ شروع ہو جانے کے بعد نہالے۔ اس سوال کا

جواب اس حدیث سے ملتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فجر کا وقت آگیا اور روزہ شروع ہونے کے بعد آپ نے غسل فرمایا۔ پھر اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ یہ غسل وہ نہیں تھا جو خواب میں لاحق ہونے والی جنابت سے لازم آتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کی حالت میں روزہ شروع کیا جا سکتا ہے اور اس سے روزے میں کوئی خرابی یا قباحت واقع نہیں ہوتی۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اگر یہ بات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان نہ فرماتیں تو مسلمانوں کو کیسے معلوم ہوتی اور اگر معلوم نہ ہوتی تو انھیں اپنی پرائیویٹ زندگی میں کیسی دقتیں اور الجھنیں پیش آتیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپؐ کے گھر والوں کی ایک بہت بڑی قربانی تھی کہ انھوں نے زندگی کے اس پہلو تک کو لوگوں سے چھپا کر نہیں رکھا بلکہ اس کے متعلق ضروری معلومات دیں تاکہ لوگوں کو اپنی زندگی کے اس پہلو کے متعلق رہنمائی مل سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بڑا عظیم الشان ایثار تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے گھر والوں نے کیا۔ آج کچھ بے وقوف ایسے بھی ہیں جو اس چیز کے متعلق اعتراض کرتے ہیں کہ حدیث میں یہ کیسی باتیں آگئی ہیں جو ازواج مطہراتؓ نے بیان فرمائی ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ اگر امہات المومنین کی باتیں امت کو یہ باتیں نہ بتاتیں تو امت کو ان چیزوں کے متعلق ہدایات کہاں سے ملتیں۔

احرام اور روزے کی حالت میں پچھنے لگوانے کا جواز

۴۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ وَهُوَ مُحْرِمٌ وَاحْتَجَمَ وَهُوَ

صَائِمٌ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے ہیں اس حالت میں کہ آپؐ احرام (کی حالت) میں تھے اور اس حالت میں کہ آپؐ روزے سے تھے۔ (متفق علیہ)

قدیم زمانے میں یہ طریقہ تھا اور آج کل بھی ایسا کیا جاتا ہے کہ بعض طبی ضروریات کی بنا پر جسم کے کسی حصّے پر کسی تیز دھار آلے یا نشتر سے ہلکے ہلکے شگاف دیئے جاتے ہیں جن سے خون رسنے لگتا ہے اور پھر سینگی سے اس کو چوسا جاتا ہے' اسے پچھنے لگانا کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا احرام اور روزے کی حالت میں ایسا کرنا درست ہے یا نہیں۔ اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ احرام کی حالت میں پچھنے لگائے جاسکتے ہیں۔ البتہ شرط یہ ہے کہ پچھنے لگاوقت کوئی بال نہ کٹے اگر بال کٹے گا تو احرام میں خرابی واقع ہوجائے گی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ روزے کی حالت میں بھی پچھنے لگوائے جاسکتے ہیں۔ البتہ اس میں اُس احتیاط کی ضرورت نہیں ہوتی جو حالتِ احرام میں ملحوظ رکھنی چاہیئے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ پچھنے لگانے کی اجازت کے بارے میں احادیث میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس اختلاف کی بناء پر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ پچھنے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن امام احمدؒ اس بات کے قائل ہیں کہ پچھنے لگانے سے، پچھنے لگانے اور لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا استدلال ایک دوسری حدیث کی بنیاد پر ہے جو آگے آرہی ہے۔ البتہ پیشِ نظر حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے یہ الفاظ بالکل واضح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود

روزے کی حالت میں پچھنے لگواتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر پچھنے لگوانے
سے روزہ ٹوٹتا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے۔

بھولے سے کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

۷۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ نَسِیَ وَهُوَ صَائِمٌ فَاَكَلَ اَوْ شَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَهٗ فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو روزہ دار بھولے سے کھالے یا پی لے تو اسے چاہیئے کہ اپنا روزہ پورا کرے کیونکہ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کو کھلا پلا دیا۔ (متفق علیہ)

اگر آدمی بھولے سے پیٹ بھر کر کھالے یا گلاس بھر پانی یا کوئی چیز پی لے تب بھی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا لیکن جس وقت اُسے یاد آجائے اسی وقت اپنا ہاتھ روک لے کیونکہ اگر اس کے بعد ایک بھورا یا ایک قطرہ بھی اس کے حلق سے گزر گیا تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بھولے سے اگر آدمی کوئی کام ایسا کر جائے جو روزہ توڑنے والا ہو تو اس سے روزے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی اور ایسی غلطی کی صورت میں اسے اپنا روزہ ختم نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مکمل کرنا چاہیئے۔

اس سے یہ اصول بھی نکلا کہ بھولے کی غلطی معاف ہے، اور شریعت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے۔

قصداً روزہ توڑنے کا کفارہ

۴۸۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هَلَكْتُ، قَالَ مَا لَكَ، قَالَ وَقَعْتُ عَلٰی امْرَاَتِیْ وَ اَنَا صَائِمٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَجِدُ رَقَبَةً تُعْتِقُهَا، قَالَ لَا، قَالَ فَهَلْ تَسْتَطِیْعُ اَنْ تَصُوْمَ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ، قَالَ لَا، قَالَ هَلْ تَجِدُ اِطْعَامَ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا، قَالَ لَا، قَالَ اِجْلِسْ وَمَكَثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَبَیْنَا نَحْنُ عَلٰی ذٰلِكَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَقٍ فِیْهِ تَمْرٌ وَالْعَرَقُ الْمِكْتَلُ الضَّخْمُ، قَالَ اَیْنَ السَّائِلُ قَالَ اَنَا، قَالَ خُذْ هٰذَا فَتَصَدَّقْ بِهٖ، فَقَالَ الرَّجُلُ اَعَلٰی اَفْقَرَ مِنِّیْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَاللّٰهِ مَا بَیْنَ لَابَتَیْهَا ــــ یُرِیْدُ الْحَرَّتَیْنِ ــــ اَهْلُ بَیْتٍ اَفْقَرُ مِنْ اَهْلِ بَیْتِیْ، فَضَحِكَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی بَدَتْ اَنْیَابُهٗ ثُمَّ قَالَ اَطْعِمْهُ اَهْلَكَ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا اور

اس نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں تو ہلاک ہوگیا۔ حضورؐ نے فرمایا: تجھے کیا ہوا؟ اُس نے کہا کہ میں روزے کی حالت میں اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا، کیا تیرے پاس کوئی غلام ہے جسے تو آزاد کردے؟ اس نے کہا نہیں۔ حضورؐ نے اس سے پوچھا، کیا تم دو مہینے کے مسلسل روزے رکھنے پر قادر ہو؟ اس نے کہا یہ بھی نہیں کرسکتا۔ حضورؐ نے پھر اس سے پوچھا کیا تمہارے پاس اتنا مال ہے کہ ساٹھ مسکین آدمیوں کو کھانا کھلا سکو؟ اس نے کہا یہ بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا اچھا بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر حضورؐ نے انتظار کیا۔ ابھی ہم اسی حالت میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بڑا ٹوکرا لایا گیا جس میں کھجوریں تھیں۔ آپ نے فرمایا وہ شخص جس نے مسئلہ پوچھا تھا کہاں ہے؟ اس شخص نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لے جا اور صدقہ کردے۔ (یعنی کفارے کے طور پر اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے)۔ اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہؐ کیا میں یہ کسی ایسے شخص کو لے جا کر کھلاؤں جو مجھ سے زیادہ فقیر ہو، اور خدا کی قسم مدینے کی ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان مجھ سے بڑھ کر تو کوئی فقیر ہے نہیں۔ حضور اس پر ہنس دیئے۔ یہاں تک ہنسے کہ آپؐ کی کچلیاں نمودار ہوگئیں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جاؤ یہ اپنے ہی بال بچوں کو کھلا دو" (متفق علیہ)

اس حدیث سے کئی مسائل معلوم ہوتے:

ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ اگر ایک آدمی اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے اور اور قصداً روزہ توڑ دے تو اس کا کفّارہ کیا ہے ——— پہلا کفارہ غلام

آزاد کرنا ہے۔ اگر آدمی یہ کفارہ ادا کرسکتا ہو تو اُسے یہی کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ یہ کفارہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو اس صورت میں دوسرا کفارہ یہ ہے کہ وہ دو مہینے کے مسلسل روزے رکھے' اس طرح کہ بیچ میں چھوڑے نہیں۔ اگر وہ اس پر بھی قادر نہ ہو تو پھر اس کے لیے جائز ہے کہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے مراد دونوں وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے اور اس طرح کا کھانا کھلانا جیسا کہ آدمی خود کھاتا ہے۔

یہاں تک تو مسئلے کی عمومی نوعیت تھی۔ اس کے بعد ایک خاص شکل سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان چیزوں میں سے کسی پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے کیا حکم ہے۔ اس چیز کا تعین بھی پیش نظر حدیث سے ہوتا ہے۔ جب سائل نے کہا کہ میں تو تینوں صورتوں میں کفارہ ادا کرنے پر قادر نہیں ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس مالِ زکوٰۃ میں سے جو آپؐ کے پاس آیا تھا اس شخص کی مدد فرمائی۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ بیت المال سے اس طرح کے لوگوں کی مدد کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی کسی غلطی کا مرتکب ہو جائے جس سے اس نوعیت کا شدید کفّارہ لازم آجاتا ہے اور وہ یہ کفارہ ادا کرنے پر قادر بھی نہ ہو تو اس کے لیے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو یہ کہ وہ اُس وقت تک انتظار کرے جب تک کہ اس کو ان تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کی قدرت حاصل ہو جائے (اور ہو سکتا ہے کہ اسی انتظار میں اس کی عمر گزر جائے) یا یہ کہ بیت المال سے اس کی مدد کی جائے' یا کچھ دوسرے نیک لوگ اس کی مدد کریں۔ معلوم ہوا کہ مالِ زکوٰۃ اس چیز پر بھی صرف کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کسی ایسے مقروض کا قرضہ بیت المال سے ادا کیا جا سکتا ہے جو خود قرضہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو' اسی طرح اگر کسی شخص پر اس طرح کے کفارے لازم آگئے ہوں تو ان کفاروں کے ادا کرنے میں مالِ زکوٰۃ سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ اگر بیت المال موجود نہ ہو تو جو لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں وہ مالِ زکوٰۃ سے اس

کی مدد کریں تاکہ انکا ایک مسلمان بھائی جس پیچیدگی میں پھنس گیا ہے اس سے نکل جائے۔
فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ کفارہ (جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی ہے) آیا اس صورت میں واجب آتا ہے جبکہ مباشرت روزہ توڑنے کی وجہ بنی ہو یا اس صورت میں بھی واجب آتا ہے جبکہ آدمی قصداً کھا پی لے۔ فقہاء کا ایک گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ کفارہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جب کہ مباشرت روزہ توڑنے کا سبب بنی ہو۔ دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اگر آدمی نے کسی طرح بھی قصداً روزہ توڑ دیا ہے تو اس سے یہی کفارہ لازم آتا ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تمام شکلوں میں جبکہ روزہ توڑا جائے کفارے کی یہی شکل ہے۔
اب آگے اس حدیث میں ایک بہت ہی خاص بات آتی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سائل نے یہ کہا کہ مدینے میں مجھ سے بڑھ کر کوئی مفلس نہیں ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اچھا یہ کھجوریں لے جا اور اپنے ہی اہل و عیال پر صدقہ کر دے۔ اس سلسلے میں بعض فقہا کا قول یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف اسی شخص کے لیے خاص تھا، دوسرے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے (واللہ اعلم بالصواب) کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے سہولت اور فراخی رکھی ہے اس میں کسی اور کو تنگی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اگر کوئی آدمی ایسی حالت میں ہے کہ اسے خود کھانے کو نصیب نہیں ہے اور آپ اس کے ہاتھ میں مال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے غریبوں پر صدقہ کر دے تو سوال یہ ہے کہ آخر خود اُسے یہ مال لینے کا حق کیوں نہیں پہنچتا۔ یہ صدقہ تو وہ شخص دے جس کے پاس کم از کم کھانے کو تو موجود ہو۔ لیکن جو اس فکر میں ہے کہ رات کو میرے بچے کھائیں گے کیا اور آپ اس کے ہاتھ سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلواتے ہیں تو یہ بات یقیناً محلِ نظر ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شریعت

کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے ایک مسئلہ شرعی معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فعل جذباتی نہیں تھا اور آپ کے ہر فعل سے دراصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے حدود کیا ہیں اور اس کی حقیقی روح کیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جس سے کفارہ لازم آتا ہو اور وہ شخص فی الواقع خود صدقے کا مستحق ہو تو بیت المال سے اس کی مدد کرنا جائز ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ایک مرتبہ اس مال کا مالک بنا دیا جائے اور پھر اس سے کہا جائے کہ تجھے صدقہ کرنے کا پورا حق ہے۔ لیکن اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ تو خود ہی صدقے کا مستحق ہے تو تو خود بھی اسے استعمال کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل یہ بتا رہا ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

۴۹—

روزے کی حالت میں بیوی سے میل جول کا مسئلہ[1]

۵۰۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَجُلًا سَئَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُبَاشَرَةِ لِلصَّائِمِ فَرَخَّصَ لَهٗ وَ اَتَاهُ اٰخَرُ فَسَئَلَهٗ فَنَهَاهُ، فَاِذَا الَّذِیْ رَخَّصَ لَهٗ شَیْخٌ وَاِذَا الَّذِیْ نَهَاهُ شَابٌّ۔
(رَوَاهُ اَبُوْدَاؤد)

---

[1] مولانا نے محترم نے درس میں اس حدیث کی تشریح نہیں فرمائی (مرتب)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا ایک روزہ دار کے لیے اپنی بیوی کیساتھ اختلاط (یعنی میل جول) کی اجازت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کی اجازت دے دی۔ پھر ایک دوسرا شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بھی یہی بات دریافت کی تو آپؐ نے اُسے اس چیز سے منع کر دیا ——— جس شخص کو آپؐ نے اجازت دی وہ سن رسیدہ آدمی تھا اور جس کو منع کیا وہ جوان آدمی تھا۔" (ابوداؤد)

اس حدیث کے متن میں بیوی کے ساتھ میل جول اور اختلاط کے لیے مُبَاشَرَۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ احادیث میں یہ لفظ اس سلسلے میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ جو لوگ عربی زبان نہیں جانتے اور اُردو سے عربی سمجھتے ہیں وہ اس لفظ کو بہانہ بنا کر احادیث کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں کہ یہ دیکھو ان احادیث میں کیا غلط سلط چیزیں جمع کر دی گئی ہیں۔ یہ لوگ بلا تحقیق اس طرح کے طوفان کھڑے کرتے رہتے ہیں اور در حقیقت اپنی جہالت کو حدیثِ رسول کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی غلط فہمی کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ اُردو میں لفظِ مباشرت صرف جنسی عمل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ عربی میں ایسا نہیں ہے۔

مباشرۃ کا لفظ بَاشَرَ سے ہے جس کے معنی ہیں کسی کام کو خود کرنا۔ ایک عرب جب یہ کہے گا کہ دیکھو فلاں کام دوسرے پر نہ چھوڑو بلکہ خود اس کام کو کرو تو وہ یہ کہے گا کہ اِفْعَلْہُ مُبَاشَرَۃً (یعنی اس کام کو خود کرنا)۔ یا اگر وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میں خود وہاں گیا تھا، کسی کو بھیجا نہیں تھا تو وہ یہ کہے گا کہ ذَھَبْتُ مُبَاشَرَۃً

(میں خود گیا تھا) اسی طرح اس لفظ کے ایک معنی عورت اور مرد کی باہمی جسمانی قربت کے بھی ہیں جس میں جنسی عمل شامل نہیں ـــــ یہاں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے ـــــ چنانچہ جس آدمی نے آکر مسئلہ پوچھا تھا اس نے دراصل یہ پوچھا تھا کہ کیا میں روزے کی حالت میں اختلاط کر سکتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دے دی کیونکہ وہ سن رسیدہ آدمی تھا۔ دوسرے نے آکر پوچھا تو حضورؐ نے اُسے منع کر دیا کیونکہ وہ جوان آدمی تھا ـــــ ظاہر بات ہے کہ سن رسیدہ آدمی پر جذبات کا اتنا غلبہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے لیکن جوان آدمی بسا اوقات ضبط نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ وہ روزہ توڑ بیٹھے اور ایک مشکل میں مبتلا ہو جائے۔ چنانچہ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ احتیاط برتے اور اختلاط سے پرہیز کرے۔

اس حدیث میں واضح طور پر یہ بات بتائی گئی کہ اگرچہ یہ کام جائز ہے اور یہ آخری حد ہے جس تک آدمی روزے کی حالت میں جا سکتا ہے لیکن جو آدمی ضبط نہ کر سکتا ہو اُسے چاہیئے کہ وہ اس سے پرہیز کرے۔ البتہ جو شخص اپنے اُوپر پورا قابو رکھتا ہو وہ اس رخصت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

خود بخود قے آجانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا

۵۱- عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ ذَرَعَهُ الْقَیْءُ وَهُوَ صَائِمٌ فَلَیْسَ عَلَیْهِ قَضَاءٌ وَمَنِ اسْتَقَاءَ عَمْدًا فَلْیَقْضِ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِیُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص کو قے خود آجائے اس حالت میں کہ وہ روزے سے ہو تو اس پر کوئی قضا لازم نہیں، اور جو شخص عمداً قے کرے اُسے چاہیئے کہ قضا ادا کرے۔

(ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

اگر کسی شخص کو خود بخود قے آجائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے عمداً روزہ نہیں توڑا ہے اس لیے اس کا حکم وہی ہے جو بھولے سے کھا لینے والے کا ہے۔ بھولے سے اگر کوئی شخص پیٹ بھر کر بھی کھالے تب بھی اس پر کوئی قضا نہیں۔ قضا صرف اس صورت میں ہوگی جب کہ اس نے عمداً ایسا کیا ہو۔ اسی طرح کوئی شخص اگر قصداً قے کرے تو اس صورت میں اس پر قضا لازم آئے گی۔ لیکن اگر اس کے پیٹ میں کوئی ایسی تکلیف ہو جس کی وجہ سے اُسے خود بخود قے آجائے تو چاہے قے پوری طرح سے منہ بھر کر آئے یا کئی مرتبہ آئے، اس سے اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اور نہ قضا لازم آئے گی۔

قے آجانے پر نفلی روزہ کھول لینا جائز ہے

۵۲۔ عَنْ مَعْدَانَ بْنِ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ فَلَقِيْتُ ثَوْبَانَ فِیْ مَسْجِدِ دِمَشْقَ فَقُلْتُ اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ حَدَّثَنِیْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاءَ فَاَفْطَرَ قَالَ صَدَقَ وَاَنَا صَبَبْتُ لَهٗ وَضُوْءَهٗ۔

(رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالدَّارِمِیُّ)

جناب معدانؒ بن طلحہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابُو الدرداءؓ نے مجھ سے یہ بات فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کی اور روزہ افطار کر لیا۔ معدان اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ پھر دمشق کی مسجد میں میری ملاقات حضرت ثوبانؓ سے ہوئی تو میں نے کہا کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے مجھ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قے کر کے روزہ افطار کر لیا تھا۔ حضرت ثوبانؓ نے جواب دیا کہ حضرت ابو الدرداءؓ نے سچ کہا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر خود پانی ڈالا تھا اور کلی کرنے کے لیے آپؐ کو پانی دیا تھا۔"

(ابو داؤد، ترمذی، دارمی)

واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ روزہ نفلی تھا۔ حضورؐ کو کوئی ایسی تکلیف لاحق ہوئی ہو گی جس کی وجہ سے آپؐ کو روزہ افطار کرنا پڑا۔

روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے

۵۳۔ عَنْ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَالَا أُحْصِي يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُوْدَاؤُدَ)

"حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اتنی بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے کہ میں اس کا شمار نہیں کر سکتا۔" (ترمذی، ابوداؤد)

معلوم ہوا کہ روزے کی حالت میں مسواک کی جا سکتی ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزے کی حالت میں سُرمہ لگانے کا مسئلہ

۵۴۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اشْتَكَيْتُ عَيْنِىَ اَفَاَكْتَحِلُ وَاَنَا صَائِمٌ، قَالَ نَعَمْ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی کہ میری آنکھوں میں تکلیف ہے، کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگا لوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں لگا لو۔" (ترمذی)

یہ روایت ضعیف ہے۔ تاہم اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس سے صرف اتنی گنجائش نکلتی ہے کہ سرمہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ ایک ذراسی چیز ہوتی ہے۔ لیکن اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ آنکھ میں باقاعدہ دوائی ٹپکانا بھی جائز ہے کیونکہ آنکھ اور حلق کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اگر آپ کوئی رنگین دوا آنکھ میں ڈالیں تو تھوڑی دیر کے بعد اس کا رنگ آپ کے حلق میں آجائے گا اور تھوکنے سے تھوک بھی اُسی رنگ کا نکلے گا۔

آنکھ کے برعکس کان میں دوا ڈالنا جائز ہے کیونکہ کان اور حلق کے درمیان ایسا پردہ ہوتا ہے جس سے دوا نہیں گزر سکتی۔ اگر کان کو دوا سے بھر بھی دیا جائے تب بھی کان کے پردے سے دوا کی ذراسی نمی بھی حلق میں نہیں پہنچے گی جبکہ آنکھ میں دوا ڈالنے سے فوراً حلق میں پہنچ جاتی ہے۔ چونکہ بعض لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے اس لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کان چونکہ گہرا ہوتا ہے اور اس پر بظاہر جوف کا اطلاق ہو سکتا ہے اس لیے اس میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

لیکن آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اصل میں یہ مسئلہ فقہ کا نہیں ہے بلکہ طب کا ہے۔ اگر ایک آدمی علم الاعضاء (فزیالوجی) سے واقف ہو تو وہ اسے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

روزے کی شدت کم کرنے کے لیے نہانا اور سر پہ پانی ڈالنا جائز ہے

۵۵۔ عَنْ بَعْضِ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ يَصُبُّ عَلٰى رَاْسِهِ الْمَاءَ وَهُوَ صَائِمٌ مِنَ الْعَطَشِ اَوْ مِنَ الْحَرِّ (رَوَاهُ مَالِكٌ وَاَبُوْدَاؤُدَ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ بیان فرماتے ہیں کہ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرجؔ[1] کے مقام پر دیکھا کہ آپ سر پہ پانی ڈال رہے ہیں اور اس وقت آپ روزے سے تھے، پیاس کی وجہ سے یا گرمی کی شدت کی وجہ سے۔" (مالک، ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ صحابی بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں پیاس یا گرمی کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے اپنے سر مبارک پر پانی ڈالتے ہوتے دیکھا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز سے روزے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی چنانچہ اگر آپ پانی کے ٹب میں اس طرح بیٹھے رہیں کہ آپ کا سارا جسم اس میں بھیگتا رہے اور آپ سر پہ بھی بار بار پانی ڈالتے رہیں تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ چاہے یہ عمل کتنی دیر تک ہوتا رہے یہ تو ظاہر ہے کہ پانی میں بیٹھے رہنے یا نہانے سے گرمی کی تکلیف اور پیاس کی شدت میں کمی واقع ہو گی لیکن یہ روزہ توڑنے والی

---

[1] مکے اور مدینے کے درمیان ایک مقام ہے۔

چیز نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ حلق سے پانی کا ایک قطرہ بھی گزار دیں گے تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

روزے کی حالت میں پچھنے لگوانے کا مسئلہ

۵۶۔ عَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتٰی رَجُلًا بِالْبَقِیْعِ وَھُوَ یَحْتَجِمُ وَھُوَ اٰخِذٌ بِیَدِیْ، لِثَمَانِیْ عَشْرَۃَ خَلَتْ مِنْ رَمَضَانَ، فَقَالَ اَفْطَرَ الْحَاجِمُ وَالْمَحْجُوْمُ۔

(رَوَاہُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَہ وَالدَّارِمِیُّ)

حضرت شدّاد بن اوس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع کے مقام پر تشریف لے گئے تو وہاں دیکھا کہ ایک شخص پچھنے لگوا رہا ہے۔ آپؐ اس وقت میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور اس دن رمضان کی اٹھارہ تاریخ تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ پچھنے لگانے والے اور پچھنے لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

اِس سے پہلے ایک حدیث گزری ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے تھے، لیکن یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پچھنے لگانے والے اور پچھنے لگوانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ گیا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کس حدیث کو قبول کیا جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے اِسی حدیث کو قبول کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ روزے کی حالت میں پچھنے لگانے والے اور لگوانے والے دونوں کا

روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک امام احمدؒ بن حنبل نے اس حدیث کو اس بنا پر قبول کیا ہے کہ پچھنے لگوانے میں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ جس شخص کے پچھنے لگائے جائیں اس کو خون نکلنے سے اتنی کمزوری لاحق ہو جائے کہ وہ آخر کار روزہ کھولنے پر مجبور ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص سینگی سے خون چوستا ہے اس کے لیے بھی اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ خون چوستے چوستے کہیں کوئی قطرہ اس کے حلق میں نہ چلا جائے اور وہ روزہ توڑ بیٹھے۔

لیکن اس حدیث کے بارے میں دوسری روایات سے جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں ان کے مطابق جس واقعہ کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے وہ فتح مکہ کے زمانے کی بات ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنے لگواتے ہوئے دیکھا تھا وہ حجۃ الوداع کے موقع کی بات ہے، جو یقیناً بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے فقہاء کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ چونکہ اس معاملے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مشاہدہ ترتیبِ زمانی کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بعد کے عمل کو ظاہر کرتا ہے اس لیے اس معاملے میں آخری حکم یہ ہے کہ پچھنے لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔

ساری عمر کے روزے بھی رمضان کے ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتے

۵۷۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ اَفْطَرَ یَوْمًا مِّنْ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ رُخْصَةٍ وَّلَا مَرَضٍ لَّمْ یَقْضِ عَنْهُ صَوْمُ الدَّهْرِ کُلِّهٖ وَاِنْ صَامَهٗ۔

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی والبخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر کسی شخص نے رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑا بغیر کسی رخصت (معقول عذر) کے اور بغیر کسی مرض کے تو اگر وہ ساری عمر کے روزے بھی رکھے تب بھی وہ اس کی قضا نہیں ہو سکتے۔

(احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی، بخاری)

یہ رمضان کے روزے کی قضا کا شرعی حکم نہیں ہے کیونکہ قضا روزہ اگر کوئی شخص رکھے گا تو وہ اس کا ادا ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کے عمر بھر کے روزے بھی اجر اور مرتبے کے لحاظ سے اُس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتے جو اس نے رمضان میں جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو۔ کسی شرعی عذر کی بنا پر روزہ چھوڑنا اور بات ہے کیونکہ اس صورت میں تو آدمی قضا روزہ رکھ سکتا ہے اور یہ چیز قابلِ مؤاخذہ نہیں ہے لیکن کسی شرعی عذر کے بغیر جان بوجھ کر روزہ چھوڑنا ایسا ہے کہ پھر ساری عمر کے روزے بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتے۔

یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ شریعت میں بعض چیزیں تو قانونی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض اخلاقی ——— قانونی حیثیت تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر کوئی روزہ چھوڑا ہو تو اس پر قضا لازم آئے گی اور قانون کا تقاضا فقط اتنا ہے کہ وہ قضا روزہ رکھے۔ لیکن اس کے روزہ قضا کرنے کی اخلاقی حیثیت اِس حدیث کے مطابق یہ ہے کہ ایک روزہ نہیں بلکہ عمر بھر کے روزے بھی اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتے جو اس نے رمضان کے زمانے میں جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو۔

اصل مطلوب روزے کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اس کی حقیقی روح ہے

۵۸۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ إِلَّا الظَّمَأُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ إِلَّا السَّهَرُ ۔ (رَوَاهُ الدَّارِمِيُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ جنھیں اپنے روزوں سے سوائے پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور کتنے ہی راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کرنے والے ایسے ہیں کہ جنھیں اپنی اس عبادت سے رات کی نیند سے محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (دارمی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اعمال کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو اُن کی ظاہری حیثیت ہے یعنی وہ ظاہری شکل جس کے مطابق وہ انجام دیئے جاتے ہیں اور دوسری ان کی باطنی حیثیت ہے، یعنی ان کی اصل حقیقت اور روح جو اُن سے مطلوب ہوتی ہے۔ اگر آپ شریعت کے بتاتے ہوئے طریقے کے مطابق کوئی عمل انجام دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے ذمے جو فرض تھا وہ آپ نے ادا کر دیا۔ اس کے بعد دوسری چیز ہے اس عمل کی حقیقت تو اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے جسم کے اندر روح ہوتی ہے۔ روح اگر آدمی کے جسم سے نکل جائے تو دیکھنے کو تو اس کا پورا جسم جوں کا توں موجود ہوتا ہے (اور بظاہر کوئی چیز اُس میں سے کم نہیں ہوتی) لیکن فرق یہ واقع ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ زندہ تھا اور اب زندہ نہیں ہے۔ جب تک وہ زندہ تھا تو آپ اُسے دفن کرنے کا خیال تک نہیں کر سکتے تھے لیکن اب وہ مُردہ ہے تو آپ اسے اپنے پاس رکھنے کے متعلق نہیں سوچ سکتے۔ یہی تعلق ہے اعمال کی اصل

حقیقت اور اُن کی ظاہری شکل کے درمیان ——— پس اگر ایک آدمی عمل کی وہ شکل پوری نہیں کرتا جو شریعت نے بتائی ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس کا وہ عمل بیکار ہے، اور اگر وہ اس عمل کے اندر اس کی حقیقی روح پیدا نہیں کرتا تو اس صورت میں اس کا وہ عمل خدا کے ہاں بے وزن اور بے حقیقت ہے۔

مثلاً اگر ایک آدمی نے روزہ رکھا اور اس نے دن بھر کچھ کھایا پیا نہیں تو اُس نے روزے کی ظاہری شکل کو تو پورا کر دیا لیکن اگر وہ دن بھر خدا کو بھولا رہا اور روزے کی حالت میں ہر طرح کے ناجائز افعال کرتا رہا تو اگرچہ اس کے متعلق یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ اس نے روزہ ہی نہیں رکھا یا اس کا روزہ ٹوٹ گیا کیونکہ اس نے جھوٹ بولا تھا یا کسی پر بہتان لگایا تھا یا کسی کا حق مارا تھا لیکن ظاہر بات ہے کہ اس نے روزے کے اصل مقصد کو فوت کر دیا۔ اس کا روزہ ویسے ہی بے جان ہے جیسے کوئی مردہ اور بے جان وجود ——— اس طرح درحقیقت اس شخص نے اپنے روزے سے سوائے بھوک پیاس کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص رمضان کی راتوں میں قیام کرتا ہے اور خدا کی عبادت میں وقت گزارتا ہے تو اس کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے قیام نہیں کیا، یا عبادت نہیں کی لیکن اگر اس نے اپنے اس قیام میں صحیح معنوں میں رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا نہیں کی اور اپنی عبادت کی بنا اخلاص پر نہیں رکھی تو اس کا یہ عبادت کرنا اور راتوں کو کھڑا ہونا محض ایک مشینی عمل ہے جس میں کوئی جان اور روح نہیں ہے۔ اس سے اُسے سوائے رات جگے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

پس شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ کے اعمال ظاہری شکل کے اعتبار سے بھی قانون کے مطابق ہوں اور ان کے اندر حقیقی روح بھی موجود ہو ——— ——— اعمال کی یہ حقیقی روح ہے اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کی محبت، اس کی

خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ، اس کے حضور جواب دہی کا احساس، اس کا خوف اور اس کے احکام و قوانین کی ہمہ وقت پیروی اور ان کی بجاآوری کا خیال۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے اعمال کے اندر حقیقی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہ ہوں تو ظاہری عمل کی حد تک تو قانون کی پابندی ہو جائے گی اور بظاہر آدمی اس کی خلاف ورزی سے بھی بچ جائیگا لیکن اعمال کی حقیقی روح سے محروم رہے گا۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کے اعمال کی کچھ قدر و قیمت نہ ہوگی۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

تین چیزیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا

۵۹۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثٌ لَا یُفَطِّرْنَ الصَّائِمَ اَلْحِجَامَۃُ وَالْقَیْئُ وَالْاِحْتِلَامُ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں روزہ دار کا روزہ نہیں توڑتیں:

۱۔ پچھنے لگانا یا لگوانا۔ ۲۔ قے کا آنا اور

۳۔ خواب میں جنابت کا لاحق ہو جانا۔ (ترمذی)

اس حدیث میں قے سے مراد وہ قے ہے جو خود بخود آجائے۔ وہ قے مراد نہیں جو آدمی کسی ضرورت یا تکلیف کی بنا پر خود منہ میں انگلی ڈال کر یا کسی دوسرے طریقے سے کرے۔ ایسی صورت میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضا لازم آتی ہے۔

روزے کی حالت میں پچھنے لگوانے کی صحیح شرعی حیثیت

۶۰۔ عَنْ ثَابِتٍ الْبُنَانِیِّ قَالَ سُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ كُنْتُمْ

تَكْرَهُونَ الْحِجَامَةَ لِلصَّائِمِ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ لَا إِلَّا مِنْ اَجْلِ الضُّعْفِ
(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

جناب ثابت بنانیؒ (جو تابعی ہیں) بیان کرتے ہیں کہ حضرت انسؓ بن مالک سے پوچھا گیا کہ کیا آپ لوگ (یعنی صحابہ کرامؓ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں روزہ دار کے لیے پچھنے لگوانے کو مکروہ سمجھتے تھے؟ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ اس وجہ سے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے ضعف لاحق ہو جاتا ہے۔ (بخاری)

معلوم ہوا کہ چونکہ پچھنے لگوانے سے کمزوری لاحق ہو جاتی ہے اور اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ اس سے کوئی ایسی ناقابل برداشت تکلیف ہو جائے جس سے روزہ توڑنا پڑ جائے تو اس بنا پر صحابہ کرامؓ پچھنے لگوانے سے پرہیز کرتے تھے لیکن وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ بجائے خود پچھنے لگوانے سے روزے میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی ہے۔

بعض احادیث میں چونکہ یہ ذکر آیا ہے کہ پچھنے لگوانے سے پچھنے لگوانے اور لگانے والے دونوں کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اس لیے تابعینؒ نے صحابہ کرامؓ سے ملاقاتیں کر کے یہ معلومات حاصل کیں کہ اس معاملے میں فی الواقع شرعی پوزیشن کیا ہے۔ یہ حدیث اسی چیز پر روشنی ڈالتی ہے۔

روزے کی حالت میں پچھنے لگوانے کے متعلق حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا عمل

۶۱۔ عَنِ الْبُخَارِيِّ تَعْلِيْقًا قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ

يَحْتَجِمُ وَهُوَ صَائِمٌ، ثُمَّ تَرَكَهُ، فَكَانَ يَحْتَجِمُ بِاللَّيْلِ۔

امام بخاریؒ تعلیقاً (یعنی سند کے حوالے کے بغیر) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کا طریقہ یہ تھا کہ وہ روزے کی حالت میں پچھنے لگوایا کرتے تھے۔ بعد میں اُنھوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا اور رات کے وقت پچھنے لگوانے لگے۔ (بخاریؒ)

امام بخاریؒ کا طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات وہ کسی مسئلے کی وضاحت میں کسی صحابی یا تابعی کا کوئی فعل بغیر سند کے نقل کر دیتے ہیں۔ ایسے اقوال و افعال کو باقاعدہ احادیث میں شمار نہیں کیا جاتا لیکن ان کا ایک وزن ضرور ہے کیونکہ امام بخاری محقق آدمی تھے اور اُنھوں نے تعلیقاً بھی جو کچھ کہا ہے وہ بے حقیقت نہیں ہے۔

امام بخاریؒ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر روزے میں پچھنے لگوانا مکروہ ہوتا یا اس سے روزے میں کوئی خرابی واقع ہوتی تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسا نہ کرتے۔ بعد میں اُنھوں نے دن کو پچھنے لگوانے کا طریقہ چھوڑ کر رات کو پچھنے لگوانے کا طریقہ اس لیے اختیار کیا کہ عمر میں اضافے سے وہ روزے میں دن کے وقت پچھنے لگوانے سے کمزوری محسوس کرنے لگے تھے۔

کُلّی کرنے کے بعد تھوک نگلنے اور مصطگی وغیرہ چبانے کا مسئلہ

۶۲۔ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ إِنْ مَضْمَضَ ثُمَّ أَفْرَغَ مَا فِيهِ مِنَ الْمَاءِ لَا يَضِيرُهُ أَنْ يَزْدَرِدَ رِيقَهُ، وَمَا بَقِيَ فِي فِيهِ، وَلَا يَمْضَغُ الْعِلْكَ فَإِنِ ازْدَرَدَ رِيقَ الْعِلْكِ لَا أَقُولُ إِنَّهُ يُفْطِرُ وَلٰكِنْ يُنْهٰى عَنْهُ۔

(رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ فِي تَرْجَمَةِ بَابٍ)

جناب عطاءؒ (جو مشہور تابعی اور بہت بڑے فقیہ ہیں) مسئلہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص (روزے کی حالت میں) کلّی کرے اور پھر منہ سے پانی بالکل نکال دے تو اس کے لیے اپنا تھوک نگلنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور وہ بھی کہ جو کچھ اس کے منہ میں بچ رہا ہو (یعنی اس پانی کا اثر) ——— اور وہ (روزے کی حالت میں) مصطگی نہ چبائے کیونکہ اگر اس کا اثر اس کے تھوک میں رہا اور اس نے تھوک نگلا تو میں یہ تو نہیں کہتا کہ اس شخص کا روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن اس چیز سے روکا جاتا ہے۔ (بخاری ج)

گزشتہ روایت کی طرح اسے بھی بطور حدیث کے نہیں بلکہ جناب عطاء کے ایک فتوے کے طور پر نقل کیا گیا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آدمی روزے میں کلّی کرے اور منہ سے پانی نکال دینے کے بعد بھی اس کا اثر باقی رہے تو تھوک نگلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا ——— ظاہر بات ہے کہ جب آدمی کلّی کرتا ہے تو پانی سے اس کے منہ میں کچھ تری تو پیدا ہوتی ہے اور پانی پوری طرح نکال دینے کے باوجود اس کا کچھ نہ کچھ اثر تھوک کے ساتھ اندر جاتا ہے لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو ——— البتہ اگر کوئی شخص قصداً کچھ پانی منہ میں بچا کر رکھے اور اسے تھوک کے ساتھ نگل لے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

پھر یہاں مصطگی نہ چبانے کے بارے میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے اس سے منجن یا ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کا حکم بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ جس طرح ایک آدمی منہ میں پانی لے کر نکال دیتا ہے اسی طرح وہ منجن لگاتا ہے یا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتا ہے اور اس کے بعد پوری کوشش کے ساتھ منہ کو خوب

صاف کر لیتا ہے تو اس پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا (جیسا کہ اوپر مصطگی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے) لیکن آدمی کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔
پانی تو ایک ایسی چیز ہے کہ یہ تھوک کے ساتھ مل کر پوری طرح سے نکل جاتا ہے لیکن دوسری چیزیں چونکہ کچھ نہ کچھ گاڑھی ہوتی ہیں اس لیے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ پوری کوشش کے باوجود منہ میں لگی رہ جائیں اور روزے میں خرابی کی باعث بنیں ــــ البتہ مسواک کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ مسواک کے متعلق تو یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے میں مسواک فرمایا کرتے تھے ــــ پھر اگرچہ مسواک بھی کچھ نہ کچھ چبائی جاتی ہے اور اس کا رس نکلتا ہے لیکن اس رس میں ایسا گاڑھا پن نہیں ہوتا ہے جس سے منہ میں چمٹ کر رہ جانے کا خطرہ ہو، اس لیے مسواک کے بارے میں کسی طرح کا تذبذب لاحق نہیں ہوتا ــــ البتہ دوسری چیزوں کو اس پر قیاس کرنا درست نہیں۔ اسی لیے مصطگی کی مثال دی گئی ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کا گاڑھا پن ہوتا ہے۔ ایسی ہی کچھ صورت منجن یا ٹوتھ پیسٹ کی بھی ہوتی ہے، اس لیے ان سے پرہیز ہی کرنا چاہیے[1]۔

---

[1] درس کے بعد ایک سوال کے جواب میں مولانا محترم نے وضاحت فرمائی کہ روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ کا استعمال مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ مسواک سے مختلف چیز ہے (مرتب)

بَابُ صَوْمِ الْمُسَافِر

اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنے کے احکام کیا ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

سفر کی حالت میں روزہ رکھنا اور نہ رکھنا دونوں جائز ہیں

۶۳۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ حَمْزَةَ بْنَ عَمْرِو ٍ الْاَسْلَمِیَّ قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَصُوْمُ فِی السَّفَرِ، وَکَانَ کَثِیْرَ الصِّیَامِ، فَقَالَ اِنْ شِئْتَ فَصُمْ وَاِنْ شِئْتَ فَاَفْطِرْ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت حمزہؓ بن عمرو اسلمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں سفر کی حالت میں روزہ رکھ لوں؟ ——— اور حضرت حمزہؓ کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمھارا جی چاہے تو روزہ رکھ لو، اور نہ جی چاہے تو نہ رکھو۔ (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت بھی فرما دی ہے کہ سائل کیسا آدمی تھا کیونکہ وہ بہت بڑے درجے کی فقیہ تھیں اس لیے قانونی باریکیاں ان کی نگاہ میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے واضح فرما دیا کہ حضرت حمزہؓ جنھوں نے سوال کیا تھا، کثرت سے روزے رکھنے کے عادی تھے۔ یہاں ان کا یہ سوال نفلی روزے کے بارے میں نہیں تھا بلکہ فرض روزے

کے بارے میں تھا کہ اگر رمضان میں مجھے سفر پیش آجائے تو کیا حالتِ سفر میں مجھے روزہ رکھنا چاہیئے یا نہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ تمہیں اس بات کا اختیار ہے کہ چاہے سفر میں روزہ رکھو، چاہے نہ رکھو ـــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس وضاحت سے کہ حضرت حمزہ رضی بن عمرو کثرت سے روزہ رکھنے کے عادی تھے دراصل یہ بات بتائی ہے کہ اگر ایک آدمی سال کے دوران میں بکثرت روزے رکھنے کا عادی ہو تو اُسے عام آدمیوں کی بہ نسبت روزے کی سختی کو برداشت کرنے کی زیادہ عادت اور مشق ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا آدمی حالتِ سفر میں بھی روزہ رکھے تو وہ دورانِ سفر میں روزے سے پیش آنے والی سختی کو اس آدمی کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے برداشت کر لیتا ہے جو صرف رمضان ہی میں روزے رکھنے کا عادی ہو۔

حضرت عائشہ رض کی اس وضاحت کی روشنی میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس اختیار میں ایسی مساوات نہیں ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا یا چھوڑنا دونوں بالکل مساوی درجے کے کام ہوں، بلکہ اس میں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس آدمی میں تحمّل کی زیادہ طاقت ہے اور کس آدمی میں کم ہے۔ اگر کسی آدمی میں تحمّل کی طاقت زیادہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ سفر میں روزہ رکھے لیکن اگر کسی آدمی میں یہ طاقت کم ہو تو پھر بہتر یہ ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے۔

اسی طرح یہ بات سفر کے حالات پر بھی موقوف ہے کہ کیسے حالات میں آدمی کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے اور کیسے حالات میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ فقہاء کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف ہے ـــــ امام مالک رح، امام شافعی رح اور امام ابو حنیفہ رح سفر کی حالت میں روزہ رکھنے کو افضل قرار دیتے ہیں اور نہ رکھنے کو اس سے کم درجے کا فعل قرار دیتے ہیں۔ بعض دوسرے فقہاء

روزہ نہ رکھنے کو افضل قرار دیتے ہیں اور بعض نے وہی تصریح کی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے کہ یہ چیز آدمی اور اس کے حالات اور سفر کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اس کے لیے روزہ رکھنے یا چھوڑنے میں سے کون سی صورت افضل ہے۔ اگر ایک آدمی کی قوتِ برداشت زیادہ ہو اور وہ ایسے حالات میں سفر کر رہا ہو جن میں بہت زیادہ مشقت بھی پیش آنے کا خدشہ نہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ایک آدمی کی قوتِ برداشت کم ہو اور اُسے سفر میں بھی ایسے حالات پیش آنے کا خطرہ ہو جن میں روزے کی سختی برداشت کرنا مشکل ہو جائے تو اس صورت میں اس کے لیے روزہ نہ رکھنا ہی صحیح ہے۔

سفر میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے والے ایک دوسرے پر اعتراض نہ کریں

۴۱۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِسِتَّ عَشْرَةَ مَضَتْ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ فَمِنَّا مَنْ صَامَ وَمِنَّا مَنْ اَفْطَرَ فَلَمْ یَعِبِ الصَّائِمُ عَلَی الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَی الصَّائِمِ۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم رمضان کی سولہ تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ کے لیے سفر پر نکلے تو ہم میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو روزے سے تھے اور کچھ ایسے تھے جو روزے سے نہیں تھے —— لیکن نہ تو روزہ داروں نے روزہ نہ رکھنے والوں کو ملامت کی اور نہ روزہ

نہ رکھنے والوں نے روزہ داروں پر اعتراض کیا۔

(مسلم)

اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزہ نہیں رکھتا یا روزہ رکھتا ہے تو اُسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی ایسے شخص کو ملامت کرے جس نے اس کے برعکس عمل کیا ہے، کیونکہ جب شریعت میں دونوں کاموں کا اختیار دیا گیا ہے تو کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔

اس معاملے میں شریعت کی اُس باریکی کو سمجھ لینا چاہیے جس کی بنا پر حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ بیان فرمایا ہے ——— شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شریعت کی رُو سے دو متبادل کام کرنے کا اختیار رکھتا ہو اور وہ دونوں برابر کے کام ہوں تو اس صورت میں وہ جو کام بھی کرے اس پر کسی شخص کو اس کے اُوپر اعتراض کرنے یا اُسے ملامت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس طرح درحقیقت وہ شریعت کے مزاج میں بے اعتدالی کو داخل کرنے بلکہ شریعت سازی کا اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ شریعت نے تو لوگوں کو برابر کا اختیار دیا تھا لیکن وہ ایک چیز کو دوسری پر ترجیح دے کر دوسروں کو ملامت کرنے پر اُتر آتا ہے۔ اس طرح لوگوں پر بے جا سختی کر کے جو رعایت اللہ تعالیٰ نے اُنھیں دی تھی اسے چھیننے کی کوشش کرتا ہے ——— یہ بات اگرچہ دیکھنے میں بڑی چھوٹی سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی بنا پر ملامت کر رہا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ لوگوں کے اندر اعتدال پیدا کرنے اور ان میں شریعت کے احکام کی پابندی اور اطاعت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ

اگر کوئی شخص خدا کی دی ہوئی رعایت سے جائز طور پر فائدہ اٹھا رہا ہے تو کسی کو اُس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اگر برداشت سے باہر ہو تو سفر میں روزہ نہ رکھا جائے

۶۵۔ عَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَرَأَى زِحَامًا وَرَجُلًا قَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا هٰذَا قَالُوا صَائِمٌ، فَقَالَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم ہو گیا ہے اور ایک آدمی پر سایہ کیا گیا ہے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ایک روزہ دار ہے (جس کی حالت روزے کی وجہ سے غیر ہو رہی ہے) اس پر آپؐ نے فرمایا: سفر میں (ایسا) روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ (متفق علیہ)

جن فقہاء کے نزدیک سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے ان کا استدلال اس حدیث سے ہے۔ لیکن اس حدیث سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں ہر حالت میں سفر میں روزہ رکھنے کو نیکی کے خلاف کام قرار دیا ہے یا آپ کا ارشاد خاص حالات کے ساتھ مخصوص ہے ——— یہاں خاص حالت خود سامنے موجود نظر آتی ہے کہ ایک آدمی روزے کی تکلیف سے نڈھال ہو گیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ سخت گرمی کا زمانہ تھا اور سفر بھی دن کے وقت کیا گیا تھا اس لیے اس حالت میں اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ گر گیا چنانچہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس پر سایہ کرنے

لگے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ سفر میں اس حال کا روزہ رکھا جائے ـــــــ یعنی اگر کوئی شخص سفر میں روزہ رکھے تو وہ حالات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے اور یہ دیکھے کہ آیا میری طاقت ایسی ہے کہ میں سفر کی تکلیف برداشت کرسکوں گا؟ اور یہ بھی کہ سفر میں کوئی ایسی غیر معمولی سختی پیش آنے کا خدشہ تو نہیں جو برداشت سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ جن حالات میں کوئی شخص اپنے اندر ایسی قوتِ برداشت بھی محسوس نہ کرتا ہو اور سفر بھی زیادہ سخت نظر آرہا ہو تو اس کا روزہ رکھنا اور یہ تکلیف اُٹھانا کوئی نیکی نہیں ہے۔

مشکل سفر درپیش ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے

۶۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السَّفَرِ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَنَزَلْنَا مَنْزِلًا فِي يَوْمٍ حَارٍّ فَسَقَطَ الصُّوَّامُوْنَ وَقَامَ الْمُفْطِرُوْنَ فَضَرَبُوا الْاَبْنِيَةَ وَسَقَوُا الرِّكَابَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَ الْمُفْطِرُوْنَ الْيَوْمَ بِالْاَجْرِ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور کوئی ہم میں سے روزے سے تھا اور کوئی روزے سے نہیں تھا۔ ایک سخت گرمی کے دن ہم نے ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالا تو روزہ دار تو وہاں جا کر

لیٹ گئے اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ کھڑے ہوتے اور اُنھوں نے خیمے ایستادہ کیے اور سواری کے اُونٹوں کو پانی پلایا ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آج روزہ نہ رکھنے والے اجر لُوٹ لے گئے۔ (متفق علیہ)

اِس حدیث کی رُو سے پلڑا اس قول کے حق میں جُھک رہا ہے جس کے مطابق حالتِ سفر میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔ یہاں بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ سفر میں چونکہ سخت گرمی کا زمانہ تھا اس لیے جن لوگوں نے روزہ رکھا ہوا تھا وہ روزے کی شدّت برداشت نہ کر سکے اور جاتے ہی پڑ گئے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ اُٹھ کر خیمے لگاتے اور سواریوں کو پانی پلاتے ــــــ چنانچہ جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا اُنھوں نے دوسروں کے آرام کا سامان کیا ــــــ اگر وہ بھی روزے سے ہوتے تو وہ بھی سب کے سب پڑ جاتے اور نہ کوئی خیمہ لگاتا اور نہ جانوروں کو پانی پلاتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج وہ لوگ اجر لُوٹ لے گئے جنھوں نے روزہ نہیں رکھا تھا اور اُنھوں نے لوگوں کے لیے آرام و آسائش کا سامان کیا۔

اب غور کیجیے کہ دورانِ سفر میں روزے کے جواز یا رُخصت کے متعلق جو احادیث اب تک گزری ہیں ان میں دونوں طرف کے دلائل میں ایسا وزن ہے کہ کوئی شخص نہ تو پورے زور کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے اور نہ پورے زور کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ نہ رکھنا افضل ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ بات دراصل آدمی کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنے حالات کا خود اندازہ کر کے یہ رائے قائم کرے کہ آیا وہ روزہ رکھے یا نہ رکھے ــــــ کام دونوں یکساں حیثیت کے ہیں ــــــ یہ خیال دل میں ہرگز نہ رہنا

چاہیئے کہ اگر سفر میں روزہ نہ رکھا تو اجر کم ہو جائے گا اور بعد میں قضا کرنے کی صورت میں اتنا ثواب نہیں ملے گا جو رمضان کے دنوں میں ملتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے خود ہی سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کا اختیار دیا ہے اور اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ بعد میں ان روزوں کی قضا کر لی جائے تو اس امر کے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہنی چاہیئے کہ بعد میں قضا کا روزہ رکھنے کی صورت میں اس کا وہ اجر نہیں ہوگا جو رمضان کے زمانے میں رکھنے کا ہو سکتا ہے ـــــــ رمضان کے اندر جو روزہ بلا وجہ چھوڑ دیا گیا ہو اس کا معاملہ تو یکسر مختلف ہے کیونکہ اس کی ایک قضا تو کیا آدمی ساری عمر بھی قضا ادا کرتا رہے تو اس روزے کا بدل نہیں ہو سکتی لیکن یہاں معاملہ بالکل دوسرا ہے اور اس صورت میں روزہ قضا کر کے رکھنے سے ثواب میں کسی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے حالات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر کے یہ فیصلہ کرے کہ آیا وہ سفر میں روزہ رکھے یا نہ رکھے۔ دونوں صورتوں میں جس جانب وہ زیادہ جھکاؤ محسوس کرتا ہو اُسے اختیار کرے، اجر کے لحاظ سے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

سخت مجبوری میں روزہ قبل از وقت کھول لینا درست ہے

۶۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِیْنَۃِ اِلٰی مَکَّۃَ، فَصَامَ حَتّٰی بَلَغَ عُسْفَانَ، ثُمَّ دَعَا بِمَاءٍ فَرَفَعَہٗ اِلٰی یَدِہٖ لِیَرَاہُ النَّاسُ فَاَفْطَرَ حَتّٰی قَدِمَ مَکَّۃَ وَذٰلِکَ فِیْ رَمَضَانَ، فَکَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ یَقُوْلُ: قَدْ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَفْطَرَ، فَمَنْ شَاءَ صَامَ وَمَنْ شَاءَ اَفْطَرَ ـــــــ مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ ـــــــ وَفِیْ رِوَایَۃٍ لِمُسْلِمٍ عَنْ جَابِرٍ اَنَّہٗ شَرِبَ

بَعْدَ الْعَصْرِ۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ (فتح مکہ والے سفر کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے مکے کی طرف نکلے تو راستہ بھر آپؐ روزہ رکھتے گئے یہاں تک کہ آپ عُسفان کے مقام (مدینے اور مکے کے درمیان ایک ساحلی مقام) پر پہنچے۔ وہاں آپؐ نے پانی منگوایا اور اُسے ہاتھ میں لے کر اُوپر اُٹھایا تاکہ لوگ بھی اُسے دیکھ لیں۔ پھر آپؐ نے روزہ افطار کیا۔ پھر مکے پہنچنے تک آپؐ نے روزے نہیں رکھے اور یہ واقعہ رمضان کے زمانے کا ہے ــــــ

اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے (یعنی ان کا یہ فتویٰ تھا) کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے زمانے میں حالت سفر میں روزے رکھے بھی ہیں اور چھوڑے بھی ہیں اس لیے (تمہارے لیے بھی حکم یہ ہے کہ) جو چاہے سفر میں روزہ رکھے جو نہ چاہے نہ رکھے متفق علیہ اور امام مسلم کی روایت میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے یہ الفاظ زائد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مقام عُسفان پر) پانی عصر کے بعد پیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس روایت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دن کے کس وقت روزہ کھولا تھا لیکن صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت میں یہ وضاحت موجود ہے کہ وہ عصر کا وقت تھا۔ ویسے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیان کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ دن کا وقت تھا، خواہ صبح کا ہو یا شام سے پہلے کا۔ کیونکہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری سے پہلے پانی پیا تھا تو اُسے بیان کرنے کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا۔

اور اگر مغرب کے بعد پیا تھا تو پھر بھی اس کے بیان کرنے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔
——— بہرحال حضرت جابرؓ کی روایت میں اس بات کی صراحت آگئی ہے کہ وہ عصر کا وقت تھا۔

اس حدیث میں حضرت ابن عباسؓ نے اس بات کی اچھی طرح وضاحت فرما دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اُٹھا کر پانی پیا تھا تاکہ لشکر کے سارے لوگ یہ دیکھ لیں کہ آپؐ روزہ کھول رہے ہیں۔

اِس حدیث سے ایک مزید بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر کسی شخص پر روزے کی حالت میں کوئی ایسی سختی آجائے جسے وہ برداشت نہ کر سکتا ہو تو وہ وقت سے پہلے روزہ کھول سکتا ہے ——— ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی نے کسی مجبوری کی بنا پر روزہ ہی نہ رکھا ہو اور دوسری شکل یہ ہے کہ اس نے روزہ تو رکھ لیا لیکن بعد میں کوئی ایسی سختی پیش آگئی کہ وہ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ روزہ کھول لے۔ اس طرح روزہ کھولنا روزہ توڑنے کی تعریف میں نہیں آتا کہ اس پر کفّارہ لازم آئے۔ اس کی صرف قضا لازم آتی ہے۔

——— اَلْفَصْلُ الثَّانِي ———

مسافر، دودھ پلانے والی اور حاملہ کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے

۶۸۔ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ نِ الْكَعْبِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ شَطْرَ الصَّلٰوةِ وَالصَّوْمَ عَنِ الْمُسَافِرِ وَعَنِ الْمُرْضِعِ وَالْحُبْلٰى۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ وَابْنُ مَاجَه)

حضرت انس بن مالک کعبیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مسافر سے آدھی نماز ساقط کر دی ہے اور

اُسے روزہ چھوڑنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔ اسی طرح دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

آدھی نماز ساقط کرنے سے مراد چار رکعتوں والی نمازمیں دو رکعتوں کی معافی ہے۔ یہاں چونکہ ایک اور بات بیان کرنی مقصود تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر نماز کا تفصیلی حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ صرف یہ فرمایا کہ مسافر سے نماز کا ایک حصہ ساقط کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ تین اور دو رکعتوں والی نمازمیں کوئی قصر اور معافی نہیں ہے۔ نمازمیں رخصت کے علاوہ مسافر سے روزہ رکھنے کی پابندی بھی اُٹھالی گئی ہے، البتہ ان دونوں رخصتوں میں فرق یہ ہے کہ مسافر پر روزے کی قضا تو لازم آتی ہے لیکن قصر نمازوں کی کوئی قضا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ حالتِ سفر میں وہ چار کے بجائے دو رکعتیں پڑھے اور پھر گھر پہنچ کر جو دو رکعتیں اس نے سفر میں چھوڑ دی تھیں وہ بھی ادا کرے۔

مسافر اور دودھ پلانے والی اور حاملہ عورت کو روزہ چھوڑنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ روزہ نہ رکھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ البتہ ایک مسافر اگر دورانِ سفر میں پوری نماز پڑھے تو یہ اس کے لیے درست نہیں جبکہ اگر وہ روزہ رکھنے کی استطاعت رکھتا ہو تو اُسے روزہ رکھنے کی اجازت ہے بلکہ یہ افضل ہے، جیساکہ دوسری احادیث میں یہ بات گزر چکی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں روزے چھوڑتا ہے تو اُسے اُن کی قضا ادا کرنی ہوگی۔ اس طرح اگر دودھ پلانے والی عورت دودھ پلانے کے زمانے میں اور حاملہ عورت دورانِ حمل میں غیر معمولی تکلیف محسوس کرے تو انھیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ روزہ

چھوڑ دیں۔ یہ دور گزر جانے پر بعد میں انھیں ان روزوں کی قضا ادا کرنا ہوگی۔

سفر میں مشکلات درپیش نہ ہوں تو روزہ رکھنا چاہیئے

۶۹۔ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْمُحَبِّقِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ كَانَ لَهٗ حَمُوْلَةٌ تَأْوِيْ إِلٰى شِبَعٍ فَلْيَصُمْ رَمَضَانَ حَيْثُ أَدْرَكَهٗ۔

(رَوَاهُ أَبُوْدَاوُدَ)

جناب سلمہ بن محبق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس ایسی سواری ہو جو اسے (رات تک) کسی ایسی جگہ پہنچا سکتی ہو جہاں وہ (اطمینان سے) پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے تو اسے چاہیئے کہ جہاں بھی رمضان اس پر آجائے وہ روزہ رکھے۔ (ابوداؤد)

حضورؐ نے یہاں مسافر کا حکم یہ بیان فرمایا کہ اگر کوئی شخص سفر کی حالت میں ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو یا سواری ہو تو خستہ حال ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر اس نے سفر میں روزہ رکھ لیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب کے بعد تک کسی ایسے مقام تک نہ پہنچ سکے گا جہاں وہ اطمینان سے کھا پی سکے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ روزہ نہ رکھے ــــــــ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس اچھی سواری موجود ہو اور اسے اس بات کا یقین ہو کہ وہ رات تک کسی ایسے مقام تک پہنچ جائیگا جہاں وہ اطمینان سے کھا پی سکے گا تو اسے چاہیئے کہ جہاں بھی رمضان اس پر آجائے وہ وہیں سے روزے رکھنا شروع کردے۔ یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ فَلْيَصُمْ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لازماً روزہ رکھے

کیونکہ اس سلسلے کی دوسری احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کے لیے یہ لازم نہیں ہے بلکہ اسے محض اس کی اجازت ہے۔ اس لیے اگرچہ فَلْيَصُمْ امر غائب کا صیغہ ہے (یعنی چاہیئے کہ وہ روزہ رکھے) لیکن اس کے معنی وجوب کے نہیں ہیں کیونکہ دوسری احادیث کو جمع کرنے سے یہی بات معلوم ہوتی ہے ___ اگر صرف اسی حدیث کو لے لیا جائے تو ایک آدمی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مسافر پہ روزہ رکھنا واجب ہے لیکن یہ بات درست نہ ہوگی۔

احادیث سے، اور اسی طرح قرآن مجید سے حکم معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس مضمون سے متعلق جتنی احادیث اور آیات موجود ہیں آدمی انھیں جمع کر کے کسی حکم کا استنباط کرے۔ وہ آدمی سخت غلطی کرے گا جو قرآن مجید کی کسی ایک آیت کو لے کر اس سے حکم نکالنے کی کوشش کرے اور اس بات سے صرف نظر کرے کہ قرآن میں اسی موضوع سے متعلق دوسرے مقامات پر کیا کہا گیا ہے۔ یہی صورت حدیث کے معاملے میں ہے کہ کسی ایک حدیث کو لے کر اس سے حکم نکالنے کے بجائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس موضوع سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے ارشادات کیا ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص صرف اسی حدیث کو سامنے رکھ کر حکم نکالے گا تو وہ یہ کہے گا کہ جس مسافر کو اچھی سواری میسر ہو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ حضورؐ نے فَلْيَصُمْ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، لیکن یہ درست نہ ہوگا، کیونکہ دوسری احادیث میں نہایت واضح الفاظ میں مسافر کے لیے روزہ چھوڑنے کی رعایت موجود ہے۔ اس لیے یہاں فَلْيَصُمْ کے معنی یہ ہوں گے کہ "بہتر یہ ہے کہ وہ روزہ رکھے۔"

قرآن اور حدیث میں اس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ ایک بات کو حکم کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے یعنی اس کے لیے صیغۂ امر استعمال کیا گیا ہے مگر اس

کے معنی وجوب کے نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا ہے اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (آیت ۲) "جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو" ——— یہاں اگر محض فَاصْطَادُوْا (پس شکار کرو) کے لفظ کو لے لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آدمی احرام کھولتے ہی پہلا کام یہ کرے کہ جا کر شکار کرے۔ درآنحالیکہ یہ مراد نہیں ہے ——— اصل مراد یہ ہے کہ احرام کی حالت میں تمہیں شکار کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن احرام کھولنے کے بعد تم شکار کر سکتے ہو چنانچہ یہاں اگرچہ صیغۂ امر ہے مگر وجوب کے معنی میں نہیں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ محض صیغۂ امر سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

فتح مکہ کے سفر میں حضورؐ کے روزہ افطار کرنے کا واقعہ

۷۰۔ عَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ عَامَ الْفَتْحِ اِلٰی مَکَّۃَ فِیْ رَمَضَانَ فَصَامَ حَتّٰی بَلَغَ کُرَاعَ الْغَمِیْمِ فَصَامَ النَّاسُ ثُمَّ دَعَا بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ فَرَفَعَہٗ حَتّٰی نَظَرَ النَّاسُ اِلَیْہِ ثُمَّ شَرِبَ فَقِیْلَ لَہٗ بَعْدَ ذٰلِکَ اِنَّ بَعْضَ النَّاسِ قَدْ صَامَ فَقَالَ اُولٰٓئِکَ الْعُصَاۃُ، اُولٰٓئِکَ الْعُصَاۃُ۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال رمضان کے مہینے میں مدینے سے مکے کی جانب نکلے تو راستہ بھر آپ روزے رکھتے گئے یہاں تک کہ آپ کراع الغمیم[1] کے مقام پر پہنچے۔ لوگوں نے اس روز بھی معمول کے

---

[1] کراع الغمیم: مدینے اور مکے کے درمیان ایک مقام جو عسفان کے قریب ہے۔

مطابق روزہ رکھا ـــــ پھر حضورؐ نے ایک برتن میں پانی طلب فرمایا اور اُسے ہاتھ میں لے کر اتنا اُوپر اُٹھایا کہ لوگ اسے بخوبی دیکھ لیں، پھر آپؐ نے اسے نوش فرمایا (یعنی روزہ کھول لیا) ـــــ اس کے بعد حضورؐ سے جاکر عرض کیا گیا کہ بعض لوگ ابھی تک روزے سے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ نافرمان لوگ ہیں، وہ نافرمان لوگ ہیں۔ (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکّہ کی مہم پر روانہ ہوتے تو یہ رمضان کا زمانہ تھا اور گرمی کا موسم تھا۔ آپؐ ایک لمبا سفر کرتے ہوئے جارہے تھے اور بہت بڑی مہم درپیش تھی۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر لوگ کمزور ہو گئے تو جنگ نہیں کرسکیں گے، اس لیے ان مصالح کی بنا پر آپؐ نے علانیہ روزہ کھولا تاکہ لوگ آپؐ کے اس فعل کی تقلید کرتے ہوئے روزہ کھول لیں۔ آپؐ نے لوگوں کو یہ کہلا کر نہیں بھیجا کہ روزہ کھول لیا جائے بلکہ خود ایک فعل سب کے سامنے کیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اب روزہ نہیں رکھنا ہے اور اب اس رمضان میں معافی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی جب کچھ لوگوں نے روزہ نہ کھولا اور آپ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا کہ وہ نافرمان ہیں، وہ نافرمان ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب اللہ کے رسول نے اللہ کی عطا کردہ ایک رعایت سے فائدہ اُٹھایا ہے تو یہ لوگ کون ہیں جو اس رعایت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم تو عزیمت کے مقام پر ہیں، اور ہمیں اس رخصت سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت نہیں ـــــ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہیئے کہ اگر رمضان کی حالت میں کسی آدمی کو سختی پیش آتے اور وہ روزہ نہ کھولے تو گنہگار ہوگا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کا منشا یہ تھا کہ جب میں نے روزہ کھول لیا ہے تو اس کے بعد دوسرے

لوگوں کا روزہ نہ کھولنا ایک نافرمانی کا فعل ہے ــــ ظاہر بات ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مصالح کے پیشِ نظر علانیہ روزہ افطار فرمایا تھا ان کا تقاضا یہی تھا کہ دوسرے لوگ بھی اس معاملے میں آپ کی اتباع کریں۔

سفر میں (جب کہ سختی پیش آنے کا خدشہ ہو) روزہ رکھنا مناسب نہیں

۱۷۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صَائِمُ رَمَضَانَ فِي السَّفَرِ كَالْمُفْطِرِ فِي الْحَضَرِ۔ (رَوَاهُ ابْنُ مَاجَهْ)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سفر کی حالت میں رمضان کا روزہ رکھنے والا شخص ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ شخص جو گھر پر رہتے ہوئے روزہ نہ رکھے۔

(ابن ماجہ)

جس طرح یہ غلط ہے کہ کوئی شخص گھر پر مقیم ہوتے ہوئے کسی عذر کے بغیر رمضان کا روزہ ترک کر دے اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ آدمی حالتِ سفر میں اپنے آپ کو مشکل میں ڈال کر روزہ رکھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں فعلوں کا درجہ بھی ایک سا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آدمی گھر پر ہو تو روزہ نہ رکھنا بُرا اور سفر میں ہو تو روزہ رکھنا بُرا! لیکن یہ اُس وقت ہے جبکہ سفر کی حالت میں آدمی کو سختی پیش آنے یا سختی پیش آنے کا خطرہ ہو۔ ورنہ اس سے پہلے احادیث گزر چکی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سفر کی حالت میں روزہ رکھا ہے اور صحابہ کرامؓ نے بھی روزہ رکھا ہے۔ مزید برآں ایسی حالت بھی گزری ہے کہ ایک سفر میں صحابہ کرامؓ میں سے بعض روزے سے تھے اور بعض نہیں تھے۔

اس لیے لامحالہ ان سب احادیث کی روشنی میں اس حدیث کی یہ تاویل کی جائے گی کہ سفر کی حالت میں اگر آدمی کو سختی پیش آئے یا اس کا شدید اندیشہ ہو تو اُس حالت میں روزہ رکھنا بُرا ہے ـــــ اُسی طرح بُرا ہے جس طرح کہ آدمی گھر پہ آرام سے ہو اور روزہ نہ رکھے، اگرچہ دونوں کا درجہ یکساں نہیں ہے کیونکہ یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اگر آدمی گھر پہ مقیم ہوتے ہوئے رمضان کا کوئی روزہ بغیر کسی عُذر کے چھوڑ دیتا ہے تو بعد میں عمر بھر کی قضا بھی اُس کی تلافی نہیں کر سکتی ـــــ لیکن ظاہر بات ہے کہ حالتِ سفر میں روزہ رکھنے کو ـــــ خواہ اس میں سختی ہی کیوں نہ پیش آئے ـــــ کسی طرح بھی اس درجے کا بُرا فعل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سفر میں روزہ چھوڑنے کی اجازت اللہ کی بخشی ہوئی ایک رخصت ہے

۲۷۔ عَنْ حَمْزَةَ بْنِ عَمْرٍو الْاَسْلَمِیِّ اَنَّهٗ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَجِدُ بِیْ قُوَّةً عَلَی الصِّیَامِ فِی السَّفَرِ فَهَلْ عَلَیَّ جُنَاحٌ، قَالَ هِیَ رُخْصَةٌ مِّنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَمَنْ اَخَذَ بِهَا فَحَسَنٌ وَّمَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّصُوْمَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ، میں اپنے اندر اتنی قوت پاتا ہوں کہ سفر کی حالت میں بھی روزہ رکھوں۔ اگر میں ایسا کروں تو کیا میں گنہگار ہوں گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے ایک رعایت ہے۔ اگر کوئی شخص اس رعایت سے فائدہ اُٹھائے تو یہ اچھی بات ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص روزہ رکھنا

پسند کرے تو اس کے لیے کوئی گناہ بھی نہیں۔

یہ اصل پوزیشن ہے جو اس باب کی آخری حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ صحیح ترین صورت یہی ہے کہ اگر ایک آدمی اپنے اندر اتنی قوت پاتا ہو اور اس کے حالاتِ سفر بھی سازگار ہوں تو اس کیلئے روزہ رکھنا بالکل درست ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہو کہ اس کے اندر سفر کی حالت میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے یا اس کو سختی پیش آنے کا خطرہ ہے تو اس حالت میں روزہ چھوڑ کر اللہ کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ——— کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں رعایت دے تو آدمی کے لیے مستحسن یہ ہے کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھائے۔

بَابُ الْقَضَاءِ

اس باب میں روزے کی قضا کے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

رمضان کے قضا روزے شعبان کے نصف آخر میں بھی رکھے جاسکتے ہیں

۷۲- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ يَكُونُ عَلَيَّ الصَّوْمُ مِنْ رَمَضَانَ فَمَا اسْتَطِيعُ اَنْ اَقْضِيَ اِلَّا فِي شَعْبَانَ۔ قَالَ يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ تَعْنِي الشُّغْلُ مِنَ النَّبِيِّ اَوْ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میرے ذمے رمضان کے کچھ روزے ہوتے تھے مگر میں شعبان کے سوا اور کسی مہینے میں قضا کے یہ روزے نہ رکھ پاتی تھی ـــــــ اس حدیث کے ایک راوی یحییٰ بن سعیدؒ حضرت عائشہ رضؓ کے اس قول کی وضاحت کرتے ہیں کہ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی مصروفیت کی وجہ سے شعبان سے پہلے یہ روزے نہ رکھ سکتی تھیں۔ (متفق علیہ)

پہلے ایک حدیث گزری تھی جس میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ شعبان کی پندرہ تاریخ کے بعد حضورؐ نے نفلی روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے (شعبان کے ابتدائی زمانے میں اس کی اجازت ہے) کیونکہ اگر آدمی شعبان کے آخری زمانے

میں بھی روزے رکھے تو اُسے ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے، درآنحالیکہ شعبان میں تو وہ نفلی روزے رکھتا ہے اور رمضان میں معاملہ فرض روزوں کا ہوتا ہے ـــــ یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ فرماتی ہیں کہ میں قضا کے روزے شعبان کے مہینے میں رکھتی تھی کیونکہ باقی دس مہینوں کے اندر مجھے ایسی مصروفیات رہتی تھیں جن کی وجہ سے قضا کے روزے ٹلتے رہتے تھے یہاں تک کہ شعبان آجاتا۔ انھوں نے یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ آیا وہ یہ روزے شعبان کی پندرہ تاریخ سے پہلے رکھتی تھیں یا اس کے بعد۔ لیکن حدیث کے انداز سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قضا کے روزے پندرہ تاریخ کے بعد رکھنے کا ذکر فرما رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قضا کے روزے حقیقت میں فرض ہیں اور نفل کی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے وہ اس زمانے میں بھی رکھے جا سکتے ہیں۔

نفلی اور قضا روزے رکھنے سے پہلے بیوی کو شوہر سے اجازت لینی چاہیئے

۴۷۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُوْمَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلَّا بِإِذْنِهٖ، وَلَا تَأْذَنَ فِي بَيْتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهٖ۔
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک عورت کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہو اور وہ اس کی اجازت

کے بغیر روزہ رکھے۔ اور اس کے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ کسی
شخص کو اُس کے گھر میں آنے کی اجازت دے اِلاّ یہ کہ اُس کے
شوہر نے اس کے لیے اجازت دے رکھی ہو۔ (مسلم)

• اِس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا گیا ہے کہ عورت کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ اس کا شوہر گھر پر موجود ہو لیکن وہ اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھے۔ اِس سے نفلی روزے بھی مراد ہو سکتے ہیں اور قضا کے روزے بھی ـــــ (یہاں یہ حدیث بیان بھی بابُ القضاء میں ہو رہی ہے)
ـــــ چونکہ قضا کے روزوں میں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ گیارہ مہینوں کے اندر کسی وقت رکھے جا سکتے ہیں اس لیے عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے اپنے شوہر سے اس بات کی اجازت لے لے۔ اس کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر روزے رکھنے شروع کر دے، خواہ نفلی ہوں یا قضا کے۔ کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز شوہر کے لیے باعث تکلیف ہو سکتی ہے۔ ایسی کسی چیز سے میاں بیوی کے درمیان چپقلش واقع ہونا یا کم از کم شوہر کے دل میں بیوی کے لیے ناراضی کا جذبہ پیدا ہونا شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔ شریعت اس بات کو بڑی اہمیت دیتی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہوں کیونکہ ان تعلقات میں ناخوشگواری کے نتائج بہت بڑے اور دُور رس ہوتے ہیں۔ اسلیے شریعت اس بات کو ملحوظ رکھتی ہے کہ کسی معاملہ میں زوجین کے درمیان کسی قسم کی بدمزگی پیدا نہ ہونے پائے ـــــ بعض حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ شوہر کو بیوی کا روزہ رکھنا (خواہ وہ نفلی ہو یا قضا کا) اتنا ناگوار محسوس ہوتا ہے کہ وہ روزے ہی کے متعلق نامناسب الفاظ اپنی زبان سے نکال بیٹھتا ہے جس کی وجہ

سے نہ صرف میاں بیوی کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ آدمی بھی گنہگار ہوتا ہے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ روزہ رکھنے سے پہلے بیوی اپنے شوہر سے اس بات کی اجازت لے لے ____ البتہ رمضان کے روزوں کا معاملہ مختلف ہے۔ رمضان کے زمانے میں شوہر کی اجازت اور رضامندی حاصل کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ رمضان کے روزے چھوڑنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

حائضہ عورت پر روزوں کی قضا لازم آتی ہے مگر نمازوں کی نہیں

۷۵۔ عَنْ مُعَاذَةَ الْعَدَوِيَّةِ اَنَّهَا قَالَتْ لِعَائِشَةَ: مَا بَالُ الْحَائِضِ تَقْضِي الصَّوْمَ وَلَا تَقْضِي الصَّلٰوةَ قَالَتْ عَائِشَةُ: كَانَ يُصِيبُنَا ذٰلِكَ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلٰوةِ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

ایک تابعی خاتون مُعاذہ عَدویہؒ بیان کرتی ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ ایک حائضہ عورت ایامِ ماہواری میں جو روزے چھوڑتی ہے ان کی قضا تو وہ ادا کرتی ہے لیکن جو نمازیں چھوڑتی ہے ان کی قضا ادا نہیں کرتی۔ ____ حضرت عائشہ رضؓ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) ہم پر یہ حالت گزرتی تھی تو ہمیں یہ حکم تو دیا جاتا تھا کہ ہم روزوں کی قضا کریں لیکن یہ حکم نہیں دیا جاتا تھا کہ ہم نمازوں کی قضا بھی کریں۔ (مسلم)

یہاں دیکھیے سوال کرنے والی خاتون اس بات کی علت دریافت کرتی

ہیں کہ حائضہ عورت ایام ماہواری کے روزوں کی قضا کیوں ادا کرتی ہے جبکہ نماز کی قضا ادا نہیں کرتی، لیکن حضرت عائشہؓ اس کے جواب میں فرماتی ہیں کہ حکم یہی ہے۔
اگرچہ اس حکم کے اندر مصلحت موجود ہے اور غور کرنے سے وہ سمجھ میں بھی آسکتی ہے لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قانون اور حکم یہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ علت تمھاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے تمھارا کام اس قانون کی پابندی کرنا ہے۔ یہ گویا ایک مسلمان کی اولین صفت ہے ـــ اگر وہ یہ شرط لگاتا ہے کہ میں حکم اُس وقت مانوں گا جب مجھ پر اس کی مصلحت واضح ہو جائے گی تو وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے۔ ایک شخص جب اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لے اور خدا کی کتاب کے متعلق یہ جان لے کہ یہ کتاب برحق ہے تو اس کا کام حکم کی اطاعت کرنا ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر حکم کی علت اور مصلحت بھی اس کی سمجھ میں آتے اور کسی پر یہ لازم بھی نہیں ہے کہ وہ اسے اس کی حکمت و مصلحت بتائے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے اُس کا کام یہ ہے کہ جہاں اللہ کا حکم اس کے سامنے آئے وہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔

جہانتک اس حدیث کا تعلق ہے اسمیں بیان کردہ حکم کی حکمت اور مصلحت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ نماز دن میں پانچ وقت فرض ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک عورت کو ایام ماہواری میں آٹھ یا دس روز تک نماز چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ذمے قضا کی چالیس یا پچاس نمازیں ہو گئیں جو اسے بعد میں ادا کرنی پڑیں گی۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح اسے سخت مشکل پیش آئے گی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں رعایت فرمائی اور نماز کی قضا لازم نہیں کی۔ ـــــــ اس کے برعکس روزوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ سال کے ایک مہینے میں فرض ہوتے ہیں اور قضا ہونے کی صورت

میں سال کے باقی مہینوں میں کسی وقت بھی رکھے جا سکتے ہیں اس لیے یہاں وہ رعایت نہیں دی گئی جو نماز کے بارے میں دی گئی ہے ـــــــ یہ ایک بالکل واضح بات تھی اور حضرت عائشہؓ چاہتیں تو وہ سوال کرنے والی خاتون کو اس حکم کی حکمت اور علت بتا سکتی تھیں، لیکن انھوں نے حکمت بتانے کے بجائے صرف حکم بتا دینے پر اکتفا فرمایا

کیا فوت شدہ آدمی کے روزوں کی قضا اُس کے ولی کے ذمے ہو گی

۷۶۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کا ولی اس کے بدلے میں روزے رکھے۔ (متفق علیہ)

یہ ایک پیچیدہ فقہی بحث ہے کہ اگر کوئی شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اس کے ذمے کچھ روزے رہ گئے ہوں تو آیا اس کے ولی پر ان کی قضا لازم آتی ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں چونکہ متعدد احادیث آئی ہیں اور ان میں اختلاف ہے اس لیے اِس حدیث کے بارے میں بھی بحث پیدا ہوتی ہے اور فقہاؒ کے مسالک بھی مختلف ہو گئے ہیں ـــــــ امام احمد بن حنبلؒ اس حدیث کی بنا پر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمے رمضان کے روزے رہ جائیں تو اس کے ولی کو اس کی طرف سے روزے رکھنے ہوں گے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اس بات کے قائل نہیں ہیں۔ یہ آئمہ اس حدیث کو رد تو نہیں کرتے البتہ وہ اس کی تاویل کرتے ہیں ـــــــ اول تو ان کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ یہاں رمضان کے روزے

ہی مراد ہوں بلکہ نذر کے روزے بھی مراد ہو سکتے ہیں ۔ (یعنی اگر کسی شخص نے نذر مانی تھی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اتنے روزے رکھوں گا لیکن یہ نذر پوری کرنے سے قبل وہ فوت ہو گیا تو اب اس کا ولی اس کی طرف سے یہ روزے رکھ سکتا ہے ۔ دوسرے یہ ضروری نہیں ہے کہ صیغۂ امر کے معنی لازماً وجوب کے ہوں (جیسا کہ پہلے بھی ایک حدیث کی وضاحت کے سلسلے میں یہ بات گزر چکی ہے) اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہاں اس سے مراد یہ ہو کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھ سکتا ہے ۔۔۔ تیسرے یہ کہ اس سلسلے کی بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اُن احادیث سے پہلے کی ہے ۔ اس لیے ان فقہا کے نزدیک اب یہ حکم منسوخ سمجھا جائے گا ۔

اِس سلسلے کی دوسری احادیث آگے آ رہی ہیں ۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

فوت شدہ آدمی کے قضا روزوں کے بدلے میں مساکین کو کھانا کھلانے کا مسئلہ

۷۷ ۔ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ فَلْيُطْعَمْ عَنْهُ مَكَانَ كُلِّ يَوْمٍ مِسْكِينٌ ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ : وَالصَّحِيحُ أَنَّهُ مَوْقُوفٌ عَلَى ابْنِ عُمَرَ)

جناب نافعؒ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جو شخص اس حالت میں فوت ہو جائے کہ اُس کے ذمے رمضان کے روزے ہوں تو اس کی طرف سے ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین آدمی کو کھانا کھلایا جائے (یعنی اس کا فدیہ دیا جائے ۔ (ترمذی)

امام ترمذیؒ کے نزدیک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اپنا فتویٰ ہے۔ یعنی یہ ثابت نہیں ہے کہ یہ بات حضورؐ نے فرمائی ہے، بلکہ مضبوط سندوں سے جو روایات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اپنی رائے ہے ــــ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمّے رمضان کے روزے رہ گئے ہوں اور وہ فوت ہو جائے تو اس کی طرف سے فدیہ کے طور پر مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔ یہ وہی فدیہ ہے جو اس کی زندگی میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے ــــ

قرآن مجید میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص بیماری وغیرہ کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے وہ فدیہ ادا کرے۔ یعنی ہر روزے کے بدلے میں کسی مسکین کو کھانا کھلائے۔ اب فرض کیجئے کہ وہ بیماری کے زمانے میں کھانا نہیں کھلا سکا اور فوت ہو گیا تو اس کے بعد اس کے ولی کو چاہیئے کہ وہ اس کے فدیہ کے طور پر ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

اگر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مانا جائے تو اس صورت میں یہ اُوپر والی حدیث کے خلاف پڑتا ہے جس کی رُو سے یہ حکم نکلتا ہے کہ ایسے شخص کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے۔ لیکن اگر اسے حضرت ابن عمرؓ کا قول مانا جائے ــــ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر کا یہ فتویٰ حضورؐ کے ارشاد سے خلاف ہے حالانکہ یہ ایک یقینی امر ہے کہ اگر ان کے علم میں یہ بات ہوتی کہ اس سلسلے میں حضور کا ارشاد یہ ہے کہ ولی کو روزہ رکھنا چاہیئے تو وہ ہرگز اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے۔ اس لیے فقہاء اس بات سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اگر پہلے وہ حکم تھا بھی کہ ولی کو روزہ رکھنا چاہیئے تو بعد کے حکم سے منسوخ ہو گیا۔ یا پھر اس کی یہ تاویل کرنا ہو گی کہ اس میں امر کا صیغہ وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے صرف اس بات کی اجازت نکلتی ہے کہ ولی روزہ رکھ سکتا ہے۔

اَب اس سلسلے کی تیسری حدیث آگے آرہی ہے ۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے میں نہ روزہ رکھ سکتا ہے نہ نماز پڑھ سکتا ہے

۷۸ - عَنْ مَالِكٍ ، بَلَغَهٗ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُسْئَلُ هَلْ يَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ اَوْ يُصَلِّيْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ ، فَيَقُوْلُ لَا يَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا يُصَلِّيْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ ۔

(رَوَاهُ مَالِكٌ فِي الْمُوَطَّأ)

امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب یہ مسئلہ پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی شخص دوسرے کے بدلے میں روزے رکھ سکتا ہے یا کوئی شخص دوسرے کی جگہ نماز پڑھ سکتا ہے تو آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ نہ کوئی شخص کسی کی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے اور نہ کسی کی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے ۔

(مالکؒ)

اِس سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ فتویٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کے خلاف نہیں پڑتا کیونکہ اگر بفرضِ محال یہ مان لیا جائے کہ حضورؐ کا وہ حکم ——— کہ آدمی کے ولی کو اس کے بدلے میں روزہ رکھنا چاہیئے ——— انھیں نہیں پہنچا تھا تو وہ صحابہ کرامؓ کا زمانہ تھا ، بہت سے صحابیؓ ایسے ہو سکتے تھے جو اُن سے کہتے کہ جب حضور کا حکم یہ ہے تو آپ یہ فتوے کیسے دے رہے ہیں ۔ لیکن چونکہ ان سے کسی نے یہ بات نہیں کہی اس لیے اس سے یہ معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ کسی شخص کے روزوں کی قضا کسی دوسرے شخص کے ذمّے لازم نہیں آتی ، خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو ۔

بَابُ صِيَامِ التَّطَوُّعِ

تَطَوُّع کے معنی ہیں اپنی رضا و رغبت سے کوئی کام کرنا ۔ یہ فرض کے مقابلے میں ہوتا ہے ۔ فرض تو وہ چیز ہے جس کی پابندی کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن تَطَوُّع وہ چیز ہے جو آدمی خود اپنی مرضی سے کرے بغیر اس کے کہ وہ اس پر فرض اور لازم کی گئی ہو ۔ چنانچہ صِیامِ تَطَوُّع سے مراد نفلی روزے ہیں اور اس باب میں انہی کا ذکر ہے ۔

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

حضورؐ سب سے زیادہ نفلی روزے شعبان میں رکھتے تھے

۷۹ ۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يُفْطِرُ وَيُفْطِرُ حَتّٰى نَقُوْلَ لَا يَصُوْمُ ، وَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ ، وَمَا رَأَيْتُهٗ فِيْ شَهْرٍ اَكْثَرَ مِنْهُ صِيَامًا فِيْ شَعْبَانَ ، وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَتْ : كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ كُلَّهٗ ، كَانَ يَصُوْمُ شَعْبَانَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تو مسلسل روزے رکھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ

ہم یہ سمجھتے کہ اب آپ روزہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور کبھی روزے
نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ ہم یہ سمجھتے کہ اب آپ روزہ نہیں
رکھیں گے۔ اور میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ حضورؐ نے کسی پورے
مہینے کے روزے رکھے ہوں سوائے رمضان کے۔ اور میں نے کبھی یہ نہیں
دیکھا کہ آپ نے شعبان سے زیادہ کسی مہینے کے روزے رکھے ہوں ـــــ
دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ شعبان کے کم ہی دن ایسے ہوتے تھے جنہیں
حضورؐ روزہ نہیں رکھتے تھے گویا کہ آپؐ پورے شعبان کے روزے رکھ لیتے تھے۔

اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورؐ کے نفلی روزوں
کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔ آئندہ احادیث میں آپ کو حضورؐ کے نفلی روزوں
کے متعلق مختلف اقوال ملیں گے جن سے معلوم ہوگا کہ نفلی روزوں کے بارے
میں آپ کا کیا طرزِ عمل تھا۔ یہاں حضرت عائشہؓ یہ بتا رہی ہیں کہ کبھی تو ایسا
ہوتا تھا کہ آپ مسلسل روزے رکھتے چلے جاتے تھے اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ
آپؐ مسلسل روزے رکھنا چھوڑ دیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں حضورؐ نے
نوافل کے بارے میں کوئی ایک مقرر طریقہ اختیار نہیں کیا ہوا تھا۔

حضرت عائشہؓ نے دوسری بات یہ بیان فرمائی ہے کہ رمضان کے
سوا آپؐ نے کبھی کسی پورے مہینے کے روزے نہیں رکھے۔ البتہ صرف
شعبان ایسا مہینہ تھا جس میں آپؐ باقی مہینوں سے زیادہ روزے رکھا کرتے
تھے اور بسا اوقات شعبان میں اتنے روزے رکھتے تھے کہ گویا آپ نے
پورے مہینے ہی کے روزے رکھ لیے ـــــ اس چیز کا خاص طور پر ذکر
اس لیے کیا گیا ہے کہ حضورؐ نے دوسرے لوگوں کو یہ ہدایت فرما دی تھی کہ
نصف شعبان کے بعد نفلی روزے نہ رکھے جائیں کیونکہ اس سے انسان کو

ایسی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے جو رمضان کے روزوں پر اثر انداز ہونے والی ہو۔ البتہ وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جن کے ذمے مثلاً قضا یا نذر کے روزے رہ گئے ہوں یا کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ان خاص دنوں ہی میں نفلی روزے رکھنے کے عادی ہوں۔ چنانچہ اس طرح کی مستثنیٰ صورتوں کو چھوڑ کر حضورؐ کی عام ہدایت یہی تھی ـــــ معلوم ہوا کہ حضورؐ کی یہ ہدایت صرف دوسرے لوگوں کے لیے تھی اور آپؐ کا اپنا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ شعبان میں زیادہ سے زیادہ روزے رکھا کرتے تھے۔

حضورؐ رمضان کے سوا کسی پورے مہینے کے روزے نہیں رکھتے تھے

۸۰۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ أَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ شَهْرًا كُلَّهُ، قَالَتْ مَا عَلِمْتُهُ صَامَ شَهْرًا كُلَّهُ إِلَّا رَمَضَانَ وَلَا أَفْطَرَهُ كُلَّهُ، حَتّٰى يَصُوْمَ مِنْهُ، حَتّٰى مَضٰى لِسَبِيْلِهٖ۔
(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

جناب عبداللہ بن شقیقؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی پورے مہینے کے روزے رکھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میرے علم میں نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رمضان کے سوا کسی پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں اور اسی طرح یہ بات بھی میرے علم میں نہیں ہے کہ حضورؐ نے کبھی کوئی مہینہ ایسا چھوڑا ہو جس میں کوئی ایک روزہ بھی نہ رکھا ہو۔ اور یہ طریقہ آپ کا اُس وقت تک رہا جب تک کہ آپ اپنے

راستے پر نہ چلے گئے۔ (مسلم)
مراد یہ ہے کہ اپنی دُنیوی زندگی کے خاتمے تک حضورؐ کا طریقہ یہی تھا کہ کبھی رمضان کے سوا کسی مہینے کے پورے روزے آپ نے نہیں رکھے، اور کبھی کوئی ایسا مہینہ بھی نہیں گزرا جس میں آپؐ نے کوئی روزہ نہ رکھا ہو۔

شعبان کے آخری دو دنوں کے روزوں کا مسئلہ

۸۱۔ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ سَاَلَهٗ اَوْسَاَلَ رَجُلًا وَعِمْرَانُ يَسْمَعُ فَقَالَ: يَا اَبَا فُلَانٍ اَمَا صُمْتَ مِنْ سَرَرِ شَعْبَانَ، قَالَ لَا، قَالَ: فَاِذَا اَفْطَرْتَ فَصُمْ يَوْمَيْنِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت فرمایا (یا یہ ہے کہ حضورؐ نے کسی دوسرے شخص سے دریافت فرمایا اور میں سُن رہا تھا ــــ بعد کے راویوں کو یہ شک ہو گیا ہے کہ حضورؐ کا سوال کس سے تھا) کہ اے فلاں، کیا تم نے شعبان کے آخری دو دن کے روزے نہیں رکھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: (کہ اگر تم نے اِن دونوں کے روزے نہیں رکھے تو) جب تم موجودہ (رمضان کے) روزوں سے فارغ ہو جاؤ تو کچھ دوسرے دو دنوں کے روزے (ان کے بدلے میں) رکھ لینا۔ (متفق علیہ)
اس روایت میں یہ اختلاف واقع ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا

سوال کس سے تھا۔ بعد کے راویوں کو یہ یاد نہیں رہا کہ حضرت عمران بن حُصینؓ نے یہ کہا تھا کہ مجھ سے حضورؐ نے یہ سوال کیا تھا، یا یہ کہا تھا کہ کسی شخص سے آپ نے پوچھا تھا اور میں سُن رہا تھا۔ تاہم یہ بات ثابت ہے کہ حضرت عمران بن حُصینؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کی ہے ــــــ اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو راوی حضرت عمران بن حصینؓ سے یہ حدیث روایت کر رہے ہیں غالباً وہ فقیہ نہیں تھے اس لیے اُنھوں نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ یہ سوال حضورؐ نے اُن سے کیوں کیا تھا اور اُنھیں وہ روزے رکھنے کی تاکید کیوں فرمائی تھی ــــــ اس بات کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے یہ غلط فہمی لاحق ہوتی ہے کہ کیا شعبان کے آخری دو دنوں کا روزہ رکھنا ضروری ہے اور اگر ایک آدمی یہ روزے نہ رکھ سکا ہو تو بعد کے دنوں میں ان کی قضا لازم آجاتی ہے ؟ ــــــ

دوسری روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غالباً صورت یہ پیش آئی تھی کہ وہ صاحب جن سے حضورؐ نے یہ سوال کیا تھا یا تو اُن کے ذمّے قضا یا نذر کے روزے تھے یا وہ ان دنوں میں نفلی روزوں کا التزام کیا کرتے تھے جیسا کہ نفلی روزوں کے متعلق مختلف لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ حضرات ہر مہینے کے درمیانی تین دن کے نفلی روزے رکھتے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ کوئی اور دن مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان صاحب نے مہینے کے آخری دنوں کا التزام کر رکھا ہو ــــــ اب ظاہر ہے کہ اُن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ بات دریافت فرمانے کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کے علم میں یہ بات ہو کہ نذر یا قضا کے کچھ روزے اُن کے ذمے تھے، یا ان دنوں کے روزوں کا وہ التزام کیا کرتے تھے، اس لیے آپ نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا تم نے

یہ روزے رکھ لیے ؟ —— اب خود ان صاحب کے یہ روزے نہ رکھنے کا سبب بھی بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرھویں شعبان کے بعد روزے نہ رکھنے کی ہدایت فرمادی تھی اس لیے انھوں نے ان دنوں میں روزے رکھنے بند کر دیے —— اس پر حضورؐ نے انھیں مسئلہ بتانے کے لیے یہ سوال دریافت فرمایا کہ کیا تم نے ان دنوں کے روزے رکھ لیے ؟ جب انھوں نے کہا کہ نہیں رکھے تو آپؐ نے فرمایا کہ اب ان کے بدلے میں دوسرے دنوں کے روزے رکھ لینا تاکہ جو التزام تم کیا کرتے ہو وہ پورا ہو جائے۔ (یا تمھارے ذمے نذر یا قضا کے جو روزے ہیں وہ ادا ہو جائیں)۔

یہی اس حدیث کی تاویل ہو سکتی ہے ورنہ اگر اس کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ شعبان کے آخری دو دنوں کے روزے رکھنا ضروری ہے اور اگر نہ رکھے جائیں تو ان کی قضا لازم آتی ہے تو یہ ایک ایسی بات ہو گی جو نہ کسی دوسری حدیث سے ثابت ہوتی ہے اور نہ کوئی فقیہ اس بات کا قائل ہے۔

ماہِ محرم کے روزوں اور نمازِ تہجد کی فضیلت

۸۲- عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اَفْضَلُ الصِّیَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَھْرُ اللّٰہِ الْمُحَرَّمُ وَاَفْضَلُ الصَّلٰوۃِ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ . . . صَلٰوۃُ اللَّیْلِ۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رمضان کے بعد سب سے افضل روزے محرم کے مہینے کے ہیں، اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز

صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) ہے۔ (مسلم)

محرم کے روزوں کے متعلق آگے مختلف احادیث آرہی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشورا کے روزے کا التزام فرماتے تھے اور محرم کے مہینے میں زیادہ روزے رکھتے تھے۔ یہاں یہ معلوم ہوا کہ رمضان کے سوا دوسرے دنوں میں سب سے زیادہ بہتر دن جن میں روزہ رکھا جائے محرم کا مہینہ ہے ـــــ اس کی مختلف علتیں ہو سکتی ہیں لیکن چونکہ اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی اس لیے یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محرم کے مہینے کے نفلی روزے دوسرے مہینوں کی بہ نسبت کیوں کر زیادہ فضیلت رکھتے ہیں۔

اس حدیث میں دوسری بات رات کی نماز کے متعلق فرمائی گئی ہے۔ رات کی نماز سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ وہ نماز جو آدمی خاموشی کے ساتھ رات کی تنہائی میں پڑھتا ہے اور وہ نوافل جن کا علم خود آدمی کے اور اس کے خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرائض کے بعد سب سے زیادہ افضل اور پسندیدہ ہیں۔

جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جب ایک موقع پر ایک چیز کو افضل کہا جاتا ہے اور دوسرے موقع پر دوسری کو تو اس میں درحقیقت کوئی تضاد یا تناقض نہیں ہوتا۔ بعض کاموں کی فضیلت کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ دراصل لوگوں کو یہ توجہ دلانے کے لیے آئی ہیں کہ فلاں کام بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے کرنے کا بڑا اجر ہے۔ ایسے مواقع پر اس کام کی تعریف ایسے انداز سے کی گئی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے شوق اور لگن پیدا ہو۔ پھر بعض اوقات ایک ہی وقت میں متعدد کاموں کے لیے افضل کا لفظ آیا ہے۔ اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ بس ان سے زیادہ فضیلت رکھنے والا دوسرا کوئی کام نہیں ہے۔ حقیقت میں بہت سے کام ایسے

ہو سکتے ہیں جو افضل ہوں ـــــ اب مثلاً یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ محرم میں نفلی روزے رکھنا بہت افضل ہے' ـــــ دوسری جگہ عرفہ (یعنی نویں ذی الحجہ) کے روزے کو بڑی فضیلت والا قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں حقیقت میں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ عرفہ کے دن کا روزہ بھی بڑی فضیلت رکھتا ہے اور محرم (یعنی عاشورہ) کا روزہ بھی بڑی فضیلت کا حامل ہے ـــــ اسی طرح فرمایا کہ فرض نماز کے بعد سب سے زیادہ افضل صلوٰۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری کوئی نماز کسی طرح کی فضیلت نہیں رکھتی ہے یا کم تر درجے کی فضیلت رکھتی ہے۔ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ احادیث میں مؤکدہ سنتوں کی بھی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ مؤکدہ سنتیں بھی بڑی فضیلت رکھتی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تہجد کی نماز بھی اپنی جگہ پر بڑی فضیلت کی حامل ہے۔ دونوں حدیثوں میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے۔

فرض نمازوں کے بعد تہجّد کی فضیلت جس بنا پر ہے وہ یہ ہے کہ فرض نماز تو رکن اسلام ہے اور اسلام کے اس رکن کو قائم کرنے کے لیے فرض نمازوں کا علانیہ اور منظم طریقے سے انجام دینا ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی عمارت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ نظام دین میں نماز کو بڑی اہمیت اور فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اس کے برعکس تہجد کی نماز بڑے اخفاء کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور جب تک آدمی کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ گہرا تعلق، بہت زیادہ محبت، اور مخلصانہ ایمان موجود نہ ہو اس وقت تک یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی راتوں کو اٹھ کر خاموشی کے ساتھ اس طریقے سے یہ نماز ادا کرے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ یہ چیز غیر معمولی اخلاص و للّٰہیت کے بغیر ممکن نہیں ہے ـــــ فرض نماز میں تو ریاکاری کا امکان ہوتا ہے کیونکہ جو شخص باقاعدگی کے ساتھ

مسجد میں نماز کے لیے جاتا ہے اس کی غرض دنیا کو یہ دکھانا ہو سکتی ہے کہ یہ صاحب بڑے نمازی ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ تہجد میں اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ تہجد تو وہی شخص ادا کرے گا جس کا اللہ کے ساتھ نہایت گہرا اور مخلصانہ تعلق ہو اور وہ لوگوں میں نام پیدا کرنے کا نہیں بلکہ اللہ کو خوش کرنے کا آرزومند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تہجد کو اس قدر فضیلت حاصل ہے۔

یہاں عاشورار، یعنی دسویں محرم کے روزے کے بارے میں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس کی فضیلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ حضرت حسینؓ کی شہادت کا دن ہے بلکہ عاشورار کی اہمیت بہت پہلے سے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے چلی آرہی تھی۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو فرعون کے مظالم سے نجات اس روز نصیب ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شکرانہ کے طور پر پابندی کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ چونکہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنّت تھی اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عاشورار کے دن کے روزے کو افضل قرار دیا اور اس کے رکھنے کی ہدایت فرمائی ــــــ آگے چل کر ایک دوسری حدیث میں اس کے متعلق مزید ایک وضاحت آرہی ہے۔

عاشوراء (دسویں محرم) کے روزے کی فضیلت

۸۲۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَارَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَحَرّٰى صِيَامَ يَوْمٍ فَضْلَهُ عَلٰى غَيْرِهٖ اِلَّا هٰذَا الْيَوْمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَهٰذَا الشَّهْرَ يَعْنِىْ شَهْرَ رَمَضَانَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دن کے روزے کی فضیلت کی بنا پر اس کا التزام کیا ہو سوائے عاشوراء کے دن کے، اور (کسی مہینے کی فضیلت کی بنا پر اس کے روزے رکھنے کا التزام کیا ہو) سوائے اس مہینے کے، یعنی رمضان کے۔ (متفق علیہ)

حضورؐ کا عمل یہ تھا کہ جس طرح آپ رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنے کا التزام فرماتے تھے اسی طرح آپ عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنے کا التزام بھی فرماتے تھے۔ اس سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حضورؐ کے نزدیک عاشوراء کے دن کی فضیلت باقی دنوں کی بنسبت زیادہ ہے۔ اسی لیے آپؐ اس کا روزہ رکھنے کا التزام فرماتے تھے۔

واضح رہے کہ عاشوراء کے روزے کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اپنا ارشاد نہیں ہے کہ عاشوراء کے دن کا روزہ سب سے افضل ہے بلکہ یہ ایک نتیجہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضورؐ کے اس التزام کو دیکھ کر خود اخذ کیا۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ آگے ایک اور حدیث آرہی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرفہ کے دن کی فضیلت عاشوراء کے دن سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں اختلاف یا تناقض پایا جاتا ہے لیکن ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا کیونکہ اس حدیث میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد نہیں فرمائی ہے بلکہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا اپنا ایک اخذ کردہ نتیجہ ہے اور آئندہ جو حدیث آرہی ہے اس میں عرفہ کی فضیلت کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ارشاد بیان ہوا ہے۔

عاشوراء کے ساتھ نویں یا گیارھویں تاریخ کا روزہ ملانا ضروری ہے

۸۴ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ حِيْنَ صَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ وَاَمَرَ بِصِيَامِهٖ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّهٗ يُعَظِّمُهُ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَئِنْ بَقِيْتُ اِلٰى قَابِلٍ لَاَصُوْمَنَّ التَّاسِعَ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ جب (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کے دن کا روزہ رکھا اور اس کے رکھنے کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ تو ایک ایسا دن ہے کہ جس کی تعظیم یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو محرم کی نویں[۹] تاریخ کا روزہ بھی رکھوں گا۔ (مسلم)

اِس سے معلوم ہوا کہ یہ بات لوگوں نے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری سال میں عرض کی تھی۔ اس سے پہلے جب آپؐ عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے تو اس وقت کسی نے آپؐ کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کرائی۔ لیکن جب آپؐ نے آخری سال یہ روزہ رکھا تو صحابہؓ نے آپؐ سے یہ بات عرض کی۔ اس سے غالباً اُن کا منشا یہ نہیں تھا کہ آپؐ یہ عمل نہ فرمائیں۔ بلکہ اپنے نزدیک وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہود اور نصاریٰ کے ہاں بھی اس دن کی فضیلت ہے اور آپؐ نے بھی اسے افضل قرار دیا ہے، ہوسکتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اس سے ہمارے تقلید کرنے کا پہلو نکال لیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں

آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ بھی ضرور رکھوں گا تاکہ میرا عمل یہود و نصاریٰ
کے عمل سے مختلف ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص عاشوراء کا روزہ
رکھنے کا ارادہ کرے اسے چاہیئے کہ وہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ
بھی اس کے ساتھ ملائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کام کے کرنے
کی خواہش یا ارادے کا اظہار کرنا بھی اس کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ آگے
ایک اور حدیث آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشوراء کے ساتھ ملا کر
نویں تاریخ ہی کا روزہ رکھنا ضروری نہیں بلکہ گیارھویں تاریخ کا روزہ بھی
رکھا جا سکتا ہے

اس بات سے آپ اسلام کے مزاج کی نزاکت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ
کس طرح اسلام ہر مقام پر مسلمانوں کی امتیازی شان برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس
بات کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ مسلمان کسی وقت بھی جا کر یہود و نصاریٰ یا دوسرے
کافروں کی تقلید کرنے لگیں۔

یہ اسی ہدایت کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے چُن چُن کر یہود و
نصاریٰ کی برائیوں کی تقلید کرنا شروع کر دی اور اب نوبت یہاں تک پہنچ
گئی ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کی کوئی ظاہری تمیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ بعض
اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک آدمی سے یہ سمجھ کر بات کر رہے ہوتے
ہیں کہ یہ مسلمان ہے لیکن کچھ دیر کے بعد یہ بات کھلتی ہے کہ یہ حضرت کسی
اور مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد
فرمایا تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب تم یہود و نصاریٰ کے قدم بقدم
چلو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسیں گے تو تم بھی اس کے
اندر گھسو گے ـــــــ تو آج وہ نقشہ پوری طرح سامنے موجود ہے۔ اور یہ

فقط اس بات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے زندگی کے تقریباً سبھی معاملات میں اسلامی شریعت کے مزاج اور اسلامی شان کو نظرانداز کر دیا ہے۔

عَرفہ (۹ ذی الحجہ) کے روزے کا مسئلہ

۸۵۔ عَنْ أُمِّ الْفَضْلِ بِنْتِ الْحَارِثِ أَنَّ نَاسًا تَمَارَوْا عِنْدَهَا يَوْمَ عَرَفَةَ فِيْ صِيَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ هُوَ صَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ لَيْسَ بِصَائِمٍ، فَأَرْسَلْتُ إِلَيْهِ بِقَدَحِ لَبَنٍ وَهُوَ وَاقِفٌ عَلٰى بَعِيْرِهٖ بِعَرَفَةَ فَشَرِبَهٗ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)۔

حضرت اُمّ الفضل بنتِ حارث بیان کرتی ہیں کہ میرے ہاں عَرَفہ کے روز لوگوں میں اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ آیا آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہیں یا نہیں۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ حضورؐ روزے سے ہیں اور بعض یہ کہتے تھے کہ آپ روزے سے نہیں ہیں۔ اس پر میں نے (حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے) حضورؐ کی خدمت میں دودھ کا ایک پیالہ بھیجا۔ آپؐ اس وقت میدانِ عرفات میں اپنے اُونٹ پر سوار تھے۔ آپؐ نے (دودھ کا پیالہ لیا اور) دودھ نوش فرمالیا۔ (متفق علیہ)

حضورؐ کے آخری حج (یعنی حجۃ الوداع) کے موقع پر عرفات کے میدان میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے ہیں یا نہیں کیونکہ جب آپؐ مدینہ طیبہ میں تھے تو عرفہ کے دن (یعنی نویں ذی الحجہ) کا روزہ لازماً رکھا کرتے تھے۔ جب حضورؐ نے اُونٹ کے

اور پہی دودھ نوش فرمالیا تو سب کو معلوم ہو گیا کہ آج آپؐ روزے سے نہیں ہیں ۔۔۔ اسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عرفۃ کا روزہ باقی سب مقامات پر تو رکھا جاتے گا لیکن جو لوگ حج انجام دے رہے ہوں اُن کے لیے اس کا نہ رکھنا ہی درست ہے کیونکہ عرفات کے میدان میں جو دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات سخت گرمی کے عالم میں کھلے میدان میں رہنا پڑتا ہے اس کے ساتھ اگر آدمی نے روزہ بھی رکھ لیا ہو تو اس سے سخت مشکل پیش آسکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ روزہ توڑنا پڑ جائے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفہ کا روزہ نہیں رکھا اور پھر اپنے عمل سے بھی سب پر یہ بات واضح فرمادی کہ آپؐ روزے سے نہیں ہیں۔

حضورؐ نے ذی الحجہ کے عشرۂ اوّل کے پورے روزے کبھی نہیں رکھے

۸۶۔ وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَائِمًا فِي الْعَشْرِ قَطُّ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے (پورے) روزے رکھے ہوں۔ (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات اس لیے بیان فرمائی کہ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذی الحجہ کے پہلے دنوں کے روزے رکھنے کا التزام فرمایا کرتے تھے اور آپ نے اس کی ہدایت بھی فرمائی ہے۔ اس سے کوئی شخص یہ قیاس کر سکتا ہے کہ حضورؐ کبھی یا ہمیشہ پہلے پورے نو دن کے روزے ضرور رکھتے ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ کے اس قول کے بارے میں بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے

کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علم میں یہ بات نہ آئی ہو کہ آپ مسلسل نو دن روزے رکھتے رہے ہیں اور بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کا اپنا عمل چاہے یہ نہ ہو کہ آپ ان پورے دنوں کے روزے رکھنے کا التزام فرماتے ہوں لیکن جب آپؐ نے ان دنوں میں روزہ رکھنے کی بہت زیادہ فضیلت بیان فرمائی ہے تو کسی کے لیے اس بات میں مضائقہ نہیں ہے کہ وہ مسلسل ان دنوں کے روزے رکھے۔

نفلی روزوں کا مسنون طریقہ

۸۷۔ عَنْ أَبِي قَتَادَةَ أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ كَيْفَ تَصُومُ، فَغَضِبَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ قَوْلِهِ، فَلَمَّا رَأَى عُمَرُ غَضَبَهُ قَالَ رَضِينَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا، نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَغَضَبِ رَسُولِهِ، فَجَعَلَ عُمَرُ يُرَدِّدُ هٰذَا الْكَلَامَ حَتّٰى سَكَنَ غَضَبُهُ، فَقَالَ عُمَرُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ كَيْفَ مَنْ يَصُومُ الدَّهْرَ كُلَّهُ، قَالَ لَا صَامَ وَلَا أَفْطَرَ أَوْ قَالَ لَمْ يَصُمْ وَلَمْ يُفْطِرْ، قَالَ كَيْفَ مَنْ يَصُومُ يَوْمَيْنِ وَيُفْطِرُ يَوْمًا، قَالَ: وَيُطِيقُ ذٰلِكَ أَحَدٌ؟ قَالَ: كَيْفَ مَنْ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا، قَالَ ذٰلِكَ صَوْمُ دَاوُدَ، قَالَ كَيْفَ مَنْ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمَيْنِ، قَالَ ذٰلِكَ وَدِدْتُ أَنِّي طُوِّقْتُ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلَاثٌ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَمَضَانُ إِلٰى رَمَضَانَ فَهٰذَا صِيَامُ الدَّهْرِ كُلِّهِ، صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ

أَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِيْ بَعْدَهٗ، وَصِيَامُ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِيْ قَبْلَهٗ (رواہ مسلم)

حضرت ابُو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپؐ کس طرح روزہ رکھتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی بات پر غصہ آیا۔ جب حضرت عمرؓ نے حضورؐ کی اس ناراضی اور غصے کو دیکھا تو یہ کہنا شروع کیا "ہم اس بات پر راضی ہو گئے کہ اللہ ہی ہمارا رب ہو، اسلام ہی ہمارا دین ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہمارے نبی ہوں۔ ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اللہ کے غضب سے، اور اس کے رسولؐ کے غضب سے" ——— حضرت عمرؓ یہ بات بار بار کہتے چلے گئے یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غصے کی کیفیت دور ہو گئی ——— پھر حضرت عمرؓ نے (خود حضورؐ سے) پوچھنا شروع کیا! یا رسول اللہ وہ شخص کیسا ہے جو ہمیشہ روزہ رکھے؟ آپ نے فرمایا "نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ اس نے روزہ چھوڑا" ——— حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا "وہ شخص کیسا ہے جو دو دن مسلسل روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے"؟ حضورؐ نے فرمایا، کیا کوئی شخص اس کی طاقت رکھتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا۔ "وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن نہ رکھے"؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، "یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ (رکھنے کا طریقہ) ہے" ——— حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا "وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن

روزہ چھوڑ دے ؟ آپؐ نے فرمایا : میں چاہتا ہوں کہ کاش مجھے اس کی طاقت حاصل ہو ـــــ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا۔ "ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنا اور پھر رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنا صَوْمِ دَھْر (یعنی ہمیشہ روزے رکھنے) کے مترادف ہے" ـــــ پھر آپؐ نے فرمایا "عرفہ کے دن کا روزہ رکھنا ایسا (اجر رکھتا) ہے کہ میں اللہ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ (اس کی برکت سے) اس سے ایک سال پہلے کے اور ایک سال بعد کے گناہوں کو بخش دے گا' اور عاشوراء کے دن کا روزہ رکھنا ایسا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ اس سے ایک سال پہلے کے گناہوں کی بخشش فرما دے گا۔ (مسلم)

حضورؐ کو اس شخص کی بات پر غصہ اس لیے آیا کہ اُسے آپؐ سے پوچھنا یہ چاہیئے تھا کہ حضورؐ میں روزہ کس طرح رکھوں، نہ یہ کہ آپؐ روزہ کیسے رکھتے ہیں۔ ہدایت اسے یہ لینی چاہیئے تھی کہ اسے روزہ کس طرح رکھنا چاہیئے نہ کہ وہ یہ معلوم کرے کہ حضورؐ کا طرزِ عمل کیا ہے۔ حضورؐ کے معمولات میں تو بہت سی عبادات ایسی تھیں جو صرف آپ کی ذات کے لیے خاص تھیں۔ مزید برآں نفلی اعمال کی اصل روح تو یہ ہے کہ انھیں چھپا کر کیا جائے نہ یہ کہ اعلان کر کے کیا جائے۔ اس لیے ان کا ظاہر کرنا بھی ناپسندیدہ ہے اور ان کے متعلق دریافت کرنا بھی غلط ہے مثلاً اگر کسی شخص سے یہ پوچھیں کہ آپؐ تہجد میں کتنی رکعتیں پڑھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو وہ آپ کے سامنے یہ اقرار کرے کہ میں تہجّد پڑھتا ہوں اور پھر اس کی رکعتیں اور دوسری تفصیلات بھی بتائے۔ تہجّد تو ہے ہی ایک ایسی نماز کہ آپ اسے لوگوں سے

چھپا کر پڑھیں تاکہ آپ کے اور آپ کے رب کے درمیان وہ ایک راز رہے اور دوسرا کوئی شخص اسے جان نہ سکے۔ جس طرح فرائض کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ علانیہ ادا کیے جاتے ہیں اس طرح نوافل کی روح یہ ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ چھپا کر انجام دیا جائے۔

اب اُس شخص کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام لوگوں میں اس بات کا اعلان کریں کہ آپ نفلی روزے کتنے اور کب کب رکھتے ہیں اور اس باب میں آپؐ کا اپنا خاص معمول کیا ہے۔ یہ چیز حضورؐ کو ناگوار گزری اور آپ نے اس پر غصے کا اظہار فرمایا تاکہ لوگ اس طرح سوالات کرکے لوگوں کے اُن اعمال کی کرید نہ کریں جو وہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان خلوص کی بنا پر چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں۔

جب حضرت عمرؓ نے وہ بات بار بار کہی جس کا ذکر حدیث میں آیا ہے اور حضورؐ کا غصہ جاتا رہا تو اس کے بعد انھوں نے اب خود سوال کرنا شروع کیا۔ اس طرح گویا اُنھوں نے یہ بتایا کہ یہی بات پوچھنے کا صحیح انداز کیا ہونا چاہیے تھا۔

حضورؐ نے یہ جو فرمایا کہ "نہ اس نے روزہ رکھا اور نہ اس نے روزہ چھوڑا" تو اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسلسل روزہ رکھتا چلا جائے اور کوئی وقفہ نہ کرے تو یہ گویا اس کی عادت ہی بن گئی۔ اس کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جس نے دن میں صرف ایک وقت کھانا کھانے کی عادت ڈال لی ہو —— ظاہر بات ہے کہ اس طرح نفلی روزے رکھنے کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ اب تو اُسے بھوک ہی اُس وقت لگے گی جو اس نے اپنے کھانے کے لیے مقرر کر لیا ہے۔ باقی اوقات میں تو وہ گویا روزے سے ہے ہی نہیں۔ اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ روزہ رکھتا ہے تو گویا نہ اُس نے

روزہ رکھا اور نہ کبھی افطار کیا۔

پھر فرمایا کہ "کیا کوئی شخص یہ طاقت رکھتا ہے کہ دو دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے"؟ مراد یہ ہے کہ آدمی کا مسلسل یہ طریقہ اختیار کرنا ایک بہت بڑی مشقت ہے جس سے عہدہ برآ ہونے پر شاید ہی کوئی قادر ہو سکتا ہو۔

حضرت عمرؓ کے یہ دریافت کرنے پر کہ وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن چھوڑے' آپؐ نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کر دیا نہ کرو۔ بس یہی فرمانے پر اکتفا کیا کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقے پر عمل کرے گا۔

جب حضرت عمرؓ نے یہ سوال کیا کہ وہ شخص کیسا ہے جو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن چھوڑ دے' تو آپؐ نے اس طریقہ کو پسندیدہ تو قرار دیا لیکن فرمایا کہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس پر ہمیشہ عمل کر سکوں ——— مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنی طاقت رکھتا ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اگر اتنی طاقت نہ رکھتا ہو تو ایسا نہ کرے۔

ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے یہ سوال مدینہ طیبہ ہی میں دریافت کیا تھا کیونکہ روزے ہجرت کے بعد فرض کیے گئے تھے۔ جب حضورؐ مدینہ طیبہ پہنچے تھے تو آپؐ کی عمر مبارک تقریباً ۵۲، ۵۳ سال کی ہو چکی تھی اور رسالت کے فرائض انجام دینے میں آپؐ کو بہت زبردست محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ ہر تیسرے دن روزہ رکھنے کی مستقل عادت اختیار فرمالیں۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ مجھ

میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں ایسا کر سکوں۔ کاش مجھ میں یہ طاقت ہوتی۔

جب حضرت عمرؓ کے سوالات ختم ہو گئے تو اب خود حضورؐ نے نفلی روزوں کے متعلق ہدایات ارشاد فرمائیں: فرمایا کہ ہر مہینے کے تین روزے رکھنا اور پھر رمضان کے پورے مہینے کے روزے رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص ہمیشہ ہی روزہ رکھے۔

مراد یہ ہے کہ نفلی عبادات کے سلسلے میں لوگوں کو اتنی لمبی چوڑی مشقتیں اٹھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ انھیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں وہ فرائض بھی انجام دینے ہیں جو خلافِ الٰہیہ کے سلسلہ میں ان پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ انھیں اپنے بال بچوں کا پیٹ بھی پالنا ہے اور دُنیا کے دوسرے کام بھی انجام دینے ہیں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے فرائض اور نوافل کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھیں اور نوافل کے لیے اپنے آپ کو ایسی مشقت میں نہ ڈالیں کہ اس کا اثر فرائض پر پڑے۔

ہر مہینے کے تین نفلی روزوں اور رمضان کے پورے مہینے کے روزوں کی فضیلت بیان کرنے کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ مزید برآں اگر آدمی عَرفَہ کے دن کا روزہ بھی رکھے تو اس کی فضیلت یہ ہے کہ اس سے ایک سال قبل اور ایک سال بعد کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور اگر عَاشُورَاء کے دن کا روزہ رکھے تو وہ ایک سال قبل کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔

اِس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ عَرَفَہ کا روزہ عَاشُورَاء کے روزے سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

یہاں کَفَّارے کے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جب عرفہ کے دن

کا روزہ آدمی کے ایک سال پہلے کے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا تو اب کھلی چھوٹ ہے کہ وہ عرفہ کا روزہ رکھے اور ایک سال تک جو جی چاہے کرتا رہے ــــــ پچھلے سال کا حساب بھی صاف اور اگلے سال کیلئے بھی چھٹی مل گئی ــــــ اس حدیث کا یہ مطلب لینا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ ایسی احادیث کے مخاطَب دراصل وہ لوگ نہیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کے بہانے تلاش کر رہے ہوں بلکہ ان کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کو رات دن یہ فکر رہتی تھی کہ ہم کون سا کام ایسا کریں جس سے ہمیں اپنے رب کی خوشنودی اور تقرّب نصیب ہو جائے۔ چنانچہ اس طرح کی باتیں دراصل اُن لوگوں کو شوق دلانے کے لیے فرمائی گئی ہیں تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل کرنے کی کوشش کریں ــــــ یہ روزے اُن گناہوں کا کفّارہ نہیں بنتے جو آدمی جان بوجھ کر بے خوفی اور ڈھٹائی کے ساتھ کرے۔ بلکہ یہ کفارہ ہیں اُن خطاؤں اور اعمال کا جو آدمی سے بشری کمزوریوں کی بنا پر سرزد ہو جاتے ہیں درآنحالیکہ اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری فرمانبرداری کرے ــــــ پھر یہ کفّارہ ہیں آدمی کی ایسی لغزشوں کا جن سے توبہ کرنے کا اسے موقع نہیں ملا اور پھر وہ انھیں بھول گیا یا کسی وجہ سے اس سے غفلت ہو گئی۔ اَب چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بنیادی طور پر ایک فرمانبردار بندہ ہے اس لیے اس کے نیک اعمال اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ یہ سراسر اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے کیونکہ وہ مغفرت کرنا چاہتا ہے غلطیوں اور خطاؤں پر پکڑنا نہیں چاہتا وہ رحیم ہے اس لیے چاہتا ہے کہ کوئی کام بندے سے ایسا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اسے بخش دے۔ چنانچہ

ایک بندۂ مومن کی نفل عبادات (خواہ وہ نفلی نمازیں ہوں یا نفلی روزے یا نفلی صدقات) سب کی سب اس کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ اور گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

پیر کے روزے کی فضیلت

۸۸۔ عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ الْاِثْنَیْنِ فَقَالَ فِیْہِ وُلِدْتُ وَفِیْہِ اُنْزِلَ عَلَیَّ۔ (رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے روزے کے متعلق سوال کیا گیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اسی دن کے اندر میں پیدا ہوا اور اسی روز مجھ پر قرآن نازل ہوا۔ (مسلم)

آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس دن کا روزہ رکھو یا نہ رکھو بلکہ صرف یہ فرمایا کہ اس دن کی فضیلت یہ ہے کہ یہ میرا یومِ پیدائش بھی ہے اور نزولِ قرآن کے آغاز کا دن بھی ہے ـــــ چنانچہ اگر کوئی شخص اس دن کا روزہ رکھے تو اس کے لیے اچھا ہے کیونکہ اس میں یہ فضیلت پائی جاتی ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو اس پر کوئی گرفت بھی نہیں ہے۔

ہر مہینے میں تین نفلی روزے رکھنا حضورؐ کی سنت ہے

۸۹۔ عَنْ مُعَاذَۃَ الْعَدَوِیَّۃِ اَنَّھَا سَاَلَتْ عَائِشَۃَ اَکَانَ

رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَصُومُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ، قَالَتْ نَعَمْ، فَقُلْتُ لَهَا مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ كَانَ يَصُومُ، قَالَتْ لَمْ يَكُنْ يُبَالِي مِنْ اَيِّ اَيَّامِ الشَّهْرِ يَصُومُ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت معاذہ عدویہؒ بیان کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں۔ میں نے پھر عرض کیا، حضورؐ مہینے کے کون سے تین دنوں میں روزہ رکھتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا، حضورؐ اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے کہ مہینے کے کون سے تین دنوں میں روزہ رکھیں۔ (مسلم)

مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے نفلی روزوں کے لیے کوئی خاص تاریخیں اور دن مقرر نہیں کر رکھے تھے۔ آپؐ جس چیز کا التزام فرماتے تھے وہ یہ تھی کہ کوئی مہینہ ایسا نہ جائے جس میں آپؐ نے تین دن کے نفلی روزے نہ رکھے ہوں۔

رمضان کے ساتھ شوال کے چھ نفلی روزے رکھنے والا صائم الدہر ہے

۹۰۔ عَنْ اَبِي اَيُّوبَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّهُ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رمضان کے پورے روزے رکھے اور پھر ان کے بعد شوال کے چھ دن کے روزے رکھے تو وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے ہمیشہ کے روزے رکھے۔ (مسلم)

اس سے پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ اگر آدمی ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھے اور پھر رمضان کے پورے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ دن کے مزید روزے رکھے تو یہ بھی ایسا ہے کہ جیسے اُس نے ہمیشہ روزہ رکھا ——— ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہ سمجھنا چاہیے۔ در حقیقت یہ اپنی اپنی جگہ دونوں کی یہی حیثیت ہے یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی چیز پر عمل کرے گا تو اسے بھی ہمیشہ روزہ رکھنے کا اجر ملے گا اور اگر دوسری چیز پر عمل کرے گا تو اس کا بھی یہی اجر ہوگا۔

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ شوال میں چھ دن کے روزے رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ لازماً عید کے اگلے ہی روز شروع کئے جائیں اور ساتویں تاریخ تک مکمل کئے جائیں بلکہ وہ پورے مہینے کے اندر کسی وقت بھی رکھے جا سکتے ہیں اور ان کا باہمی تسلسل قائم رکھنا بھی ضروری نہیں ہے۔

عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن کوئی روزہ نہیں

۹۱۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَوْمِ یَوْمِ الْفِطْرِ ... وَالنَّحْرِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا تھا۔ (متفق علیہ)

۹۲- وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ:
لَاصَوْمَ فِیْ یَوْمَیْنِ، اَلْفِطْرِ وَالْاَضْحٰی۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن کوئی روزہ نہیں ہے۔
(متفق علیہ)

یہاں پھر اسلام کی شانِ اعتدال دیکھئے۔ اگرچہ روزہ بھی اسی طرح ایک عبادت ہے جس طرح کہ نماز ایک عبادت ہے لیکن اسلام کا مزاج یہ ہے کہ نامناسب اوقات و مواقع پر عبادت انجام دینا نیکی شمار ہونے کے بجائے گناہ بن جاتا ہے۔ عید الفطر وہ دن ہے کہ جس میں تیس۳۰ دن کے روزوں کے بعد اللہ تعالیٰ آپ سے یہ چاہتا ہے کہ آپ ایک نماز عبادت کے ذریعے سے اس کا شکر بھی ادا کریں اور اس کے شکرانے کے طور پر آزادی کے ساتھ کھائیں پئیں بھی۔ اب جس دن اللہ تعالیٰ اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ آپ آزادی کے ساتھ کھائیں پئیں اور دنیوی آسائشوں اور لذتوں سے شادکام ہوں اس روز بھی اگر آپ بزعم خود زہد و پارسائی اختیار کر کے روزہ رکھ لیتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ یہ چیز سراسر اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہو گی۔ جس وقت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ آرام و آسائش حاصل کریں اس وقت آپ کا فرض ہے کہ آپ آرام و آسائش حاصل کریں اور جس وقت وہ چاہتا ہے کہ آپ مشقت اٹھائیں تو اُس وقت آپ کا یہ کام ہے کہ مشقت اٹھائیں۔ اگر آپ مشقت کے وقت بھی مشقت اٹھائیں اور آرام و آسائش کے وقت بھی مشقت اٹھائیں تو اس طرح گویا آپ اپنے رب سے یہ کہتے ہیں کہ نہیں جناب ہمیں آپ کی کسی رعایت اور عنایت کی ضرورت نہیں ہے، ہم تو اس سے بے نیاز ہیں ——

اسی چیز کا سدّباب کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین کے دن روزہ رکھنے سے سختی سے منع فرما دیا۔

ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا درست نہیں

۹۳۔ عَنْ نُبَيْشَةَ الْهُذَلِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيَّامُ التَّشْرِيْقِ اَيَّامُ اَكْلٍ وَشُرْبٍ وَذِكْرِ اللّٰهِ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت نُبَیشہ ہُذَلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایامِ تشریق کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے دن ہیں۔ (مسلم)

اَیَّامِ تَشْرِیق سے مراد بقرعید کے بعد کے تین دن ہیں، یعنی ذی الحجہ کی گیارھویں بارھویں اور تیرھویں تاریخ ـــــ اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ان دنوں میں روزہ رکھنا درست نہیں۔

جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کر لینا جائز نہیں

۹۴۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يَصُوْمُ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا اَنْ يَّصُوْمَ قَبْلَهٗ اَوْ يَصُوْمَ بَعْدَهٗ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن کا روزہ نہ رکھے اِلّا یہ کہ وہ اس سے ایک دن پہلے کا یا ایک دن بعد کا بھی روزہ

رکھے۔ (متفق علیہ)

اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کر لینا صحیح نہیں ہے ـــــ حضورؐ کے اس ارشاد سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کا مزاج کیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آدمی خود اپنا شارع نہ بنے۔ شارع صرف اللہ اور اس کا رسولؐ ہے۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی مقرر کردہ شریعت میں اپنی طرف سے قیاسات کر کے اضافہ کرنا شروع کر دے۔ اس کا نتیجہ وہی کچھ ہو گا جو یہود و نصاریٰ کے ہاں ہوا کہ انھوں نے خدا کے دین میں تحریف کر کے اس کی شکل ہی بدل ڈالی ـــــ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک خاص نماز کے لیے جمعہ کے دن کو ایک خاص فضیلت عطا کی ہے۔ اب اگر ایک آدمی یہ خیال کر کے کہ یہ دن فضیلت رکھتا ہے اس لیے اس کو روزے کے لیے مخصوص کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس نے خدا کی شریعت میں اپنے طور پر ایک اضافہ کر لیا۔ ایک فضیلت تو اس دن کو ایک خاص غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور ایک فضیلت اب اس شخص نے اپنے طور پر دے دی ـــ اگر یہ طریقہ رائج ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح رمضان کے روزوں کا التزام کیا جاتا ہے اسی طرح جمعہ کے روزے کا التزام بھی شروع ہو جائے گا اور یہ چیز نئی شریعت بنانے کے مترادف ہو گی۔ اسی لیے حضورؐ نے جمعہ کے نفلی روزے کا التزام کرنے سے منع فرما دیا ـــــ ہاں اس کی اجازت اس صورت میں دے دی جبکہ اس سے ایک دن پہلے یا بعد کا روزہ بھی رکھا جائے۔

جمعہ کی رات کو قیام کیلئے اور دن کو روزے کیلئے مخصوص کر لینا درست نہیں

۹۵۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، لَا تَخْتَصُّوا لَیْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ اللَّیَالِیْ وَلَا تَخْتَصُّوا یَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِیَامٍ مِّنْ بَیْنِ الْاَیَّامِ اِلَّا اَنْ یَّكُوْنَ فِیْ یَوْمٍ یَصُوْمُهٗ اَحَدُكُمْ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جمعہ کی رات کو قیام (نفل عبادات اور تہجد وغیرہ) کے لیے مخصوص کرو بجز اس صورت کے کہ جمعہ کسی ایسی تاریخ کو پڑ جائے جب تم میں سے کوئی شخص روزہ رکھا کرتا ہے۔ (مسلم)

اوپر اس سے متصل ہی حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت گزری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے التزام کے ساتھ جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اب اس حدیث میں وہی بات زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے۔

اس سے شریعت کے مزاج کی نزاکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شریعت میں اس معاملہ میں بہت زیادہ نزاکت پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو پابندیاں انسان پر عائد کی ہیں کوئی شخص اپنے طور پر ان میں اضافہ کر لے۔ اس سے پہلے دوسری قوموں کا جو حشر ہوا وہ اسی وجہ سے ہوا کہ لوگوں نے قیاس کر کر کے یا اپنے نفس کے ذاتی میلانات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود و فرائض پر اپنی طرف سے مزید حدود و فرائض کا اضافہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کی شریعت کے ساتھ ایک نئی شریعت اور بن گئی اور اس شریعت نے لوگوں کو باندھنا اور جکڑنا شروع کیا۔ قرآن مجید نے سورہ الاعراف میں اس چیز کو اِصر اور اَغلال

سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی لوگوں نے اپنے ہاتھ سے طوق اور سلاسل بنائے اور اپنے گلے میں پہن کر انھیں اپنے اوپر کسنا شروع کر دیا۔ آگے چل کر دہ شریعت اتنی بوجھل بن گئی کہ آخر کار لوگ اس کے بندھنوں سے نکل بھاگے اور انھوں نے خدا کی پوری شریعت ہی کو اتار کر پھینک دیا۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جب پابندیاں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو انسان آخر کار تنگ آجاتا ہے۔ ظلم یہ ہے کہ بعض مذہبی پیشواؤں کی طرف سے بڑھائی ہوئی پابندیاں عام لوگوں کے سامنے اسی حیثیت سے پیش ہوتی ہیں کہ یہ خدا کی شریعت کا حصہ ہیں چنانچہ جب لوگ ان سے تنگ آکر انھیں توڑتے ہیں تو وہ یہ تمیز کئے بغیر کہ انسانوں کی طرف سے بڑھائی ہوئی پابندیاں کون سی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حدود کون سے ہیں وہ سب کچھ توڑ تاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور بالکل آزاد ہو جاتے ہیں ——— اسی بدبختی میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوتے اور اسی خطرے میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتیں مبتلا ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت الٰہی میں یہ اصول مقرر کر دیا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جو چیز فرض کی گئی ہے بس وہی فرض ہے اور کسی کو اس میں اضافہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو کچھ واجب کیا گیا ہے بس وہی واجب ہے، کوئی شخص اس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا اضافہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ حرام وہی ہے جو خدا کی شریعت میں حرام کیا گیا ہے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ اپنی طرف سے کچھ مزید چیزوں کو حرام کر دے۔ اسی طرح مکروہ وہ چیز ہے جس کے متعلق اللہ اور اس کے رسولؐ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے، کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنی طرف سے کچھ مزید مکروہات مقرر کر دے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز کے حرام یا حلال ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے لازماً یہ بتانا

پڑے گا کہ قرآن کی کس آیت اور کس حدیث کی رو سے وہ یہ بات کہہ رہا ہے۔ اگر وہ حدیث اور قرآن کا حوالہ نہیں دیتا اور کہتا ہے کہ فلاں بزرگ نے اسے حلال یا حرام کہا تھا یا فلاں کتاب میں ایسا لکھا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسے مانیں، جب تک کہ وہ دلیل لے کر نہ آئے اور یہ نہ بتائے کہ قرآن کی کس آیت یا کس حدیث سے یہ حلت یا حرمت نکل رہی ہے ——— یہ ہے اس معاملے میں شریعت کا مزاج۔ اور یہ اس عظیم الشان حکمت کی وجہ سے ہے کہ خدا کے بندوں کو کسی ایسی پابندی میں نہیں جکڑنا چاہیئے جو خدا نے اُن پر عائد نہیں کی ہے۔ اگر لوگوں کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی طرف سے بھی اس میں اضافہ کر سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا اور اس کا رسولؐ ہی شارع نہیں کچھ دوسرے حضرات بھی شارع ہیں۔ لوگ محض خدا ہی کے بندے نہیں ہیں بلکہ کچھ دوسرے حضرات بھی ایسے ہیں جن کے وہ بندے ہیں اور اُنھیں بھی یہ حق ہے کہ وہ خدا کے بندوں پر اپنی طرف سے پابندیاں عاید کریں۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں احکام و مسائل کا استنباط کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے جیسا کہ فقہا کا طریقہ ہے، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی دلیل قرآن اور حدیث سے پیش نہ کی جا سکتی ہو دین میں اضافے کے مترادف ہے اور اس لیے ایک ایسی گمراہی ہے جس سے ایک بندۂ خدا کو خود بھی بچنا چاہیئے اور دوسرے بندگانِ خدا کو بھی اس میں مبتلا کرنے کی ذمہ داری اُٹھانے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

اب دیکھیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے متعلق یہ کیوں فرمایا کہ جمعہ کو راتوں کی عبادت اور دن کے روزوں کے لیے مخصوص نہ کر لو اِلاّ یہ کہ جمعہ کسی ایسی تاریخ کو آ پڑے جس میں تم پہلے ہی روزہ رکھا کرتے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کا دن اس غرض کے لیے مقرر کیا ہے کہ لوگ اس میں ایک خاص نماز اجتماعی طور پر ادا کریں۔ دوسری نمازوں کے متعلق تو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں قریب کوئی مسجد نہیں ہے اور وہاں اذان کی آواز نہیں پہنچتی، یا آپ کسی جنگل میں ہیں تو آپ اپنی جگہ پر نماز ادا کر سکتے ہیں اور اگر دو چار آدمی آپ کے ساتھ ہیں تو آپ وہیں جماعت کر سکتے ہیں اور یہ لازم نہیں ہے کہ آپ مسجد ہی میں جائیں لیکن جمعہ کی نماز ایسی ہے کہ یہ مسجد میں جماعت کے ساتھ ہی ادا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دن اسی لیے مقرر کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مسجد میں جمع ہو کر ایک خاص نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں اور امام کا خطبہ سنیں تاکہ ہفتے میں کم از کم ایک دن اللہ تعالیٰ کے احکام باقاعدگی کے ساتھ انھیں یاد دلائے جائیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ چونکہ جمعہ کا دن فضیلت رکھتا ہے اس لیے کیوں نہ وہ اس دن روزہ بھی رکھے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شریعت نے جمعہ کو جو فضیلت ایک خاص وجہ سے دی تھی اور اس دن کے لیے جو عبادت لازم قرار دی تھی اس نے اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کر لیا۔ پھر صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ رات کے لیے بھی ایک عبادت کو لازم ٹھہرا لیا۔ اب اگر اس کی گنجائش دے دی جاتی تو پہلے ایک آدمی یہ کام کرتا، پھر دو چار اور کرتے یہاں تک کہ گروہِ کثیر اس کام کو کرنا شروع کر دیتا۔ رفتہ رفتہ ایک دو صدی گزرنے کے بعد لوگوں کے لیے یہ لازم ہو جاتا کہ نہ صرف یہ کہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کریں بلکہ روزہ بھی رکھیں۔ اس طرح یہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا کہ کیا چیز اللہ نے فرض کی تھی اور کیا چیز لوگوں نے اپنی طرف سے اپنے اوپر عائد کر لی۔ گویا ایک ایسی چیز شریعت کا جزو قرار پا جاتی جو درحقیقت اس کا جزو نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے

رسولؐ نے واضح طور پر یہ فرمادیا کہ جمعہ کے دن کو ان نفلی عبادات کے لیے مخصوص نہ کرلو۔ اگرچہ بجائے خود نہ روزہ رکھنا کوئی بُرائی ہے نہ راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کرنا کوئی معیوب چیز ہے بلکہ دونوں چیزیں عین پسندیدہ ہیں لیکن چونکہ جمعہ کے ساتھ مخصوص کر کے ان کا التزام کرنے سے شریعت میں اضافے کا خطرہ تھا اس لیے حضورؐ نے وضاحت کے ساتھ اس سے منع فرمادیا۔

خدا کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھنے کا غیر معمولی اجر

۹۶۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ہِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَامَ یَوْمًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بَعَّدَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ عَنِ النَّارِ سَبْعِیْنَ خَرِیْفًا۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو ستّر سال کے فاصلے تک جہنم کی آگ سے دُور کر دیتا ہے۔ (متفق علیہ)

اللہ کی راہ میں روزہ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک آدمی جہاد کے لیے نکلتا ہے اور وہ اس جہاد کے لیے سفر کرتے ہوئے، یا کسی کیمپ میں قیام کی حالت میں روزہ بھی رکھتا ہے تو اس کا یہ روزہ رکھنا خدا کی راہ میں روزہ رکھنا ہے۔ یا مثلاً ایک شخص حج یا عمرے کے لیے سفر کر رہا ہے اور اس سفر کے دوران میں روزے بھی رکھتا ہے، تو اس کا یہ روزہ رکھنا خدا کی راہ میں روزہ رکھنا ہے اور اُس کے لیے ایک عظیم اجر اور فائدے کا موجب ہے۔

فی سبیل اللہ کا مطلب یوجہِ اللہِ بھی ہو سکتا ہے، یعنی خالصۃً اللہ کی رضا کی خاطر روزہ رکھنا۔ اِن دونوں صورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو جہنم کی آگ سے ستّر سال کے فاصلے تک دور کر دے گا۔ یہاں اس بات کا تعین نہیں کیا گیا کہ یہ ستر سال کی مسافت کس رفتار سے ہے۔ آیا وہ اُونٹ کی رفتار سے ہے یا انسان کے پیدل چلنے کی رفتار سے۔ کسی پرندے کے اُڑنے کی رفتار سے ہے یا کسی جیٹ ہوائی جہاز یا روشنی کی رفتار سے ہے ـــــ اصل مدعا درحقیقت یہ ہے کہ اس عمل سے انسان جہنم کی آگ سے بہت دُور ہو جاتا ہے، اتنی دُور کہ گویا ستّر سال کی مسافت درمیان میں حائل ہو جاتی ہے اور یہ صرف اتنے عمل کی بنا پر فرمایا گیا کہ اس نے اللہ کی راہ میں روزہ رکھا۔

ظاہر بات ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں نکلا ہے یعنی جہاد کے لیے جا رہا ہے اس کے متعلق یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو جان بوجھ کر گناہ کرنے والا ہو۔ اس سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے بجا طور پر وہ بہت بڑے اجر کا مستحق قرار پائے گا۔ قرآن وحدیث میں نیکوکار لوگوں کے لیے نفلی عبادات پر جن انعامات اور بھاری اجر وثواب کی بشارت دی گئی ہے وہ اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جو جان بوجھ کر گناہ کرنے والے ہوں۔ بلکہ ایسے لوگوں کے لیے ہے جن کی عام زندگیاں نیکوکاری اور صلاح وتقویٰ کا نمونہ ہوں ـــــ یہاں فی سبیل اللہ کی قید خود بتا رہی ہے کہ یہ اجر اس شخص کے لیے ہے جو نہ صرف یہ کہ فرائض ادا کرنے والا اور حرام سے بچنے والا ہے بلکہ وہ اپنی جان خدا کے رستے میں لڑانے کے لیے نکلا ہے۔ اس کے ساتھ اگر وہ نفلی روزہ بھی رکھتا ہے تو وہ یقیناً اس بات کا مستحق ہے کہ جہنم کی آگ

سے زیادہ سے زیادہ دور ہو جائے۔

اِسی طرح اس اجر کا مستحق وہ شخص بھی ہو سکتا ہے جو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے حج یا عمرے کا سفر اختیار کرتا ہے اور اس دوران میں روزہ بھی رکھتا ہے۔ جو لوگ حرام کھاتے ہوئے حج کے لیے نکلتے ہیں اور آگے بھی حرام کھاتے ہیں یہ اجر اُن کے لیے نہیں ہو سکتا کیونکہ نہ اُنھوں نے فی سبیل اللہ یہ سفر اختیار کیا اور نہ اُنھوں نے خود کو اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مستحق ٹھہرایا۔

نفلی عبادات میں اعتدال کی ضرورت

۹۷۔ وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ أَلَمْ أُخْبَرْ أَنَّكَ تَصُومُ النَّهَارَ وَتَقُومُ اللَّيْلَ، فَقُلْتُ بَلٰى يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ فَلَا تَفْعَلْ، صُمْ وَأَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ، فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَإِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ، صَوْمُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهِ، صُمْ كُلَّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَاقْرَإِ الْقُرْآنَ فِي كُلِّ شَهْرٍ. قُلْتُ إِنِّي أُطِيقُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ. قَالَ صُمْ أَفْضَلَ الصَّوْمِ، صَوْمَ دَاوُدَ، صِيَامُ يَوْمٍ وَإِفْطَارُ يَوْمٍ، وَاقْرَأْ فِي كُلِّ سَبْعِ لَيَالٍ مَرَّةً وَلَا تَزِدْ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت

عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: اے عبداللہ، کیا میں نے یہ ٹھیک سُنا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات رات بھر کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا اب ایسا مت کیا کرو، روزہ رکھو بھی اور نہ بھی رکھو اور راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو، کیونکہ تمہارے جسم کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر ایک حق ہے اور تمہارے ہاں ملاقات کے لیے آنے والے کا بھی تم پر ایک حق ہے جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے گویا کوئی روزہ نہیں رکھا — ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنا گویا صَوْمِ دَهْر (ہمیشہ روزہ رکھنے کے مترادف) ہے۔ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھو اور قرآن مہینے میں ایک مرتبہ پورا پڑھ لیا کرو — میں نے عرض کیا یا رسول اللہ، میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اچھا پھر تم افضل ترین روزہ رکھو اور وہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے، یعنی ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا (یعنی روزہ نہ رکھنا) اور ہر سات راتوں میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرو اور اس پر اضافہ ہرگز نہ کرو۔ (متفق علیہ)

آنکھوں کے حق سے مراد یہ ہے کہ کبھی تم انھیں جاگتے ہوئے کھُلا رکھو اور کبھی انھیں سونے کے لیے بند رکھو۔ ایسا نہ ہو کہ تم دن بھر بھی جاگتے رہو اور پھر رات کو بھی آرام نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی جو عظیم الشان نعمت تمھیں عطا کی ہے تم اس کے ساتھ زیادتی اور ناقدری کا معاملہ کرنا چاہتے ہو۔

ملاقات کے لیے آنے والے کے حق سے مراد یہ ہے کہ اگر تم رات رات بھر کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہے اور پھر دن کو تم نے روزہ بھی رکھا تو ظاہر ہے کہ تمہارے اندر طبیعت کی وہ تازگی اور شگفتگی باقی نہیں رہ سکتی جس سے کسی ملنے والے کا استقبال کیا جائے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ مثلاً گرمی کا زمانہ ہے اور آپ روزے سے ہیں۔ اس حالت میں جو شخص بھی آپ سے ملنے کے لیے آتا ہے آپ اس سے اُس شگفتگی اور دل کی کشادگی سے پیش نہیں آسکتے جس سے دوسری حالت میں پیش آسکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آنے والے کو تو یہ معلوم ہونا ضروری نہیں کہ آپ روزے سے ہیں۔ اگر آپ نے بے دلی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور روکھے پن سے اس سے گفتگو کی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا بُرا مانے اور یہ محسوس کرے کہ یہ عجیب انسان ہے جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ چل کر ملنے کے لیے آنے والے سے کس اخلاق سے پیش آنا چاہیئے۔
نفلی روزہ رکھنے والوں کو خاص طور پر اس کا عملی تجربہ ہوا ہو گا کہ خصوصاً گرمی کے زمانے میں جب آدمی ایک لمبے دن کے روزے سے ہو اور کوئی شخص افطار کے قریب ملنے کے لیے آجائے تو بعض اوقات آدمی اس سے بڑے رُوکھے پن سے ملتا ہے۔ اب چونکہ نفلی روزے میں آدمی خود تو یہ ظاہر نہیں کرتا کہ وہ روزے سے ہے اور آنے والے کو یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص روزے سے ہے اس لیے اس سے بعض اوقات بڑی شکایت پیدا ہوتی ہے اور تعلقات میں کشیدگی تک واقع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ــــــ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ نگاہ ہے کہ آپؐ نے یہ ساری چیزیں گنا کر بتا دیں کہ اگر ہمیشہ روزہ رکھو گے اور راتوں کو کھڑے ہو ہو کر نمازیں پڑھتے رہو گے اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو گے تو اس طرح اپنے جسم، اپنی آنکھوں، اپنی بیوی اور اپنے ملنے والوں سب کے ساتھ زیادتی کرو گے اور ان میں سے کسی کا حق ٹھیک

طرح سے ادا نہیں کر سکو گے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آدمی پر ہر وقت خشکی طاری رہے تو نہ عام لوگوں کے ساتھ ہی اس کے تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں اور نہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی وہ صحیح سلوک کر سکتا ہے۔ ہر شخص بجا طور پر دوسرے سے اچھے برتاؤ کی توقع رکھتا ہے لیکن جب یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو فطری طور پر اس کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا جو شخص ہمیشہ روزہ رکھے اس نے گویا کوئی روزہ نہیں رکھا۔ اس کی وجہ اس سے پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اگر آدمی نے عادت ہی ایک وقت کھانا کھانے کی بنا لی ہو تو گویا یہ بات اس کے معمول میں داخل ہو گئی۔ اب اگر وہ روزہ رکھتا بھی ہے تو اس کا روزہ کہاں ہوا۔ روزہ تو اس چیز کا نام ہے کہ آپ کسی وقت اپنے معمول کے خلاف اپنے نفس پر یہ بار ڈالیں کہ وہ کھانا پینا ترک کرے اور کچھ دوسری پابندیاں قبول کرے، لیکن اگر آپ کو عادت ایک ہی وقت کھانا کھانے کی پڑ گئی ہے تو آپ کے لیے روزے کی اہمیت عملاً ختم ہو گئی۔ اب اس میں کوئی غیر معمولی چیز کیا رہی۔ اسی لیے فرمایا کہ اس شخص کا کوئی روزہ نہیں جو ہمیشہ روزہ رکھے ــــــ پھر یہ ارشاد ان معنوں میں بھی ہے کہ اس طریقے سے روزہ رکھنے والے کے لیے روزے کا کوئی اجر نہیں ہے کیونکہ نیکی وہی نیکی شمار ہو گی جو شریعت کے مطابق ہو اور شریعت کی رُو سے یہ بات درست نہیں ہے کہ آدمی ہمیشہ روزہ رکھے۔

پھر فرمایا، ہر مہینے کے تین دنوں کا روزہ رکھنا گویا صومِ دہر ہے یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے کے مترادف ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہمیشہ روزہ رکھنے سے تم جس بڑے سے بڑے ثواب کی اُمید کر سکتے ہو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب تمھیں ہر مہینے کے تین دن کے روزے رکھنے پر بھی دے گا۔

یہ جو فرمایا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن پڑھ لیا کرو تو اس سے مراد تہجد کی نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس غرض کے لیے روزانہ تہجد میں ایک پارہ پڑھ لینا کافی ہے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے جواب میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں تو حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا پھر اَفْضَلُ الصَّوْمِ رکھ لیا کرو اور صوم داؤد ہے۔ اس کی تشریح یہ فرمائی کہ ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن نہ رکھو۔ یعنی اگر تم ہر ماہ تین دن سے زیادہ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہو تو پھر حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقے پر عمل کر سکتے ہو ——— پھر فرمایا: ہر سات راتوں میں ایک مرتبہ قرآن ختم کر لیا کرو اور اس پر اضافہ ہرگز نہ کرو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تمھیں اس بات کی اجازت ہے کہ سات راتوں میں ایک دفعہ قرآن ختم کر لیا کرو لیکن اس پر اضافہ کرنے کی اجازت نہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خدا کی شریعت اعتدال کو پسند کرتی ہے انتہاپسندی کو نہیں۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ آدمی تمام حقوق و فرائض میں توازن برقرار رکھے۔ سب کے حقوق ادا کرے۔ جسم کا حق بھی ادا کرے اور انسانوں کے حقوق بھی ادا کرے۔ ایسا نہ ہو کہ آدمی کسی ایک حق کو ادا کرنے میں ایسا غیر متوازن ہو جائے کہ باقی حقوق کو نقصان پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر مختلف فرائض عائد کئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نے بس نماز اور روزہ ہی فرض کیا ہو اور اس کا اجر بس انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص ہو۔ آدمی کو اپنی روزی کمانے کے لیے بھی جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور یہ بھی اس کا فرض ہے۔ اگر وہ ہمیشہ روزہ رکھے گا اور راتوں کو کھڑے ہو کر لمبی لمبی نمازیں پڑھے گا تو اس میں اتنی طاقت کہاں باقی رہے گی کہ وہ اپنی روزی بھی کمائے اور شریعت کے عائد کئے ہوئے دوسرے فرائض بھی ادا کر سکے۔ اسلئے عبادت میں بھی اعتدال ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی چیز ہمیں سکھائی گئی

ہے۔ حضورؐ نے ہمیں وظیفے بھی بتائے ہیں مگر کوئی وظیفہ ایسا نہیں ہے جو ہزار دانہ تسبیح سے رات بھر پڑھا جائے۔ آپ نے اگر زیادہ سے زیادہ تعداد میں کوئی وظیفہ بتایا ہے تو ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ پڑھنا بتایا ہے خود وظائف بھی چھوٹے چھوٹے بتائے ہیں اور جو ذرا زیادہ لمبے ہیں ان کی تعداد اس سے بھی کم کر دی ہے۔ اس طرح حضورؐ نے نفلی عبادات میں ایک خوشگوار اعتدال اور توازن کو ملحوظ رکھا ہے۔ جن لوگوں نے بعد میں ان چیزوں میں اضافہ کیا ہے درحقیقت انھوں نے خدا کی شریعت کے مزاج کو نظر انداز کر کے اعتدال کو چھوڑ کر راہبانہ انتہا پسندی اختیار کر لی ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِی

پیر اور جمعرات کے نفلی روزوں کی فضیلت

۹۸۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسَ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کے دن نفلی روزہ رکھا کرتے تھے۔ (ترمذی۔ نسائی)

آگے ایسی حدیثیں آرہی ہیں جن میں نفلی روزوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف طرزِ عمل منقول ہوتے ہیں، اس لیے اس سلسلہ میں ایک بات ابتدا میں سمجھ لینی چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور گزر جانے کے بعد جب لوگوں نے مختلف صحابہؓ سے حضورؐ کے معمولات کے بارے میں پوچھا تو جس صحابی کے علم میں جو چیز تھی اس نے وہ بیان کر دی۔ اس لیے اگر آپ کو ان احادیث میں کہیں

اختلاف نظر آئے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نفلی روزوں کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک ہی لگا بندھا معمول نہیں تھا۔ کبھی آپ کسی طرح عمل کرتے تھے اور کبھی کسی طرح۔ کیونکہ نوافل کے معاملے میں آزادی ہے۔ فرض میں تو یہ ہوتا ہے کہ جو چیز مقرر کر دی گئی وہی مقرر ہے لیکن نوافل میں یہ پابندی نہیں ہوتی۔ نوافل کے معاملے میں مختلف زمانوں میں اور مختلف اوقات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مختلف رہا، چنانچہ جن لوگوں کے علم میں حضورؐ کا جو معمول تھا انھوں نے وہی بیان کیا۔

یہاں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نفلی روزہ پیر اور جمعرات کے دن رکھا کرتے تھے ــــــ پیر کے دن کے متعلق پہلے ایک حدیث میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ میں پیر کے روز پیدا ہوا ہوں اور پیر ہی کے روز مجھ پر سب سے پہلے وحی نازل ہوئی۔ اس لیے پیر کے دن کی یہ فضیلت ہے ــــــ جمعرات کی فضیلت آگے آ رہی ہے۔

پیر اور جمعرات کے دنوں کی فضیلت

۹۹۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تُعْرَضُ الْاَعْمَالُ يَوْمَ الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسِ فَاُحِبُّ اَنْ يُّعْرَضَ عَمَلِيْ وَاَنَا صَائِمٌ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، پیر اور جمعرات کے روز اعمال کی پیشی ہوتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میرا عمل اس حالت میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں۔ (ترمذی)

اِس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ حضورؐ پیر اور جمعرات کے دن کو نفلی روزے کے لیے کیوں ترجیح دیتے تھے ــــــ رہا یہ سوال کہ پیر اور جمعرات کے روز اعمال کی کیسی پیشی ہوتی ہے تو اس کا علم صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کو حاصل ہے، کوئی دوسرا شخص وضاحت کے ساتھ اس کو نہیں جان سکتا، کیونکہ اعمال کی پیشی کا ذکر مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کس کس نوعیت کی پیشیاں ہوتی ہیں۔

ہر مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں میں روزہ رکھنے کی ہدایت

۱۰۰۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: یَا اَبَا ذَرٍّ اِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّھْرِ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ فَصُمْ ثَلَاثَ عَشْرَۃَ وَاَرْبَعَ عَشْرَۃَ وَخَمْسَ عَشْرَۃَ۔

(رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، اے ابوذر! اگر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنا چاہو تو تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے رکھا کرو (ترمذی ونسائی)

حضورؐ نے متعدد لوگوں کو یہ بات سکھائی ہے کہ اگر مہینے میں تین روزے رکھنے ہوں تو تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں کو رکھے جائیں۔ اگرچہ ایسا کرنا لازم نہیں ہے لیکن آپؐ نے اس طریقے کو پسند فرمایا ہے۔ اور خود آپؐ کا عمل بھی یہ تھا۔

حضورؐ ہر مہینے کے ابتدائی تین دنوں کے روزے رکھتے تھے

۱۰۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَصُوْمُ مِنْ غُرَّۃِ کُلِّ شَھْرٍ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ وَقَلَّمَا کَانَ یُفْطِرُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ۔

(رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ، وَرَوَاہُ اَبُوْدَاؤدَ اِلٰی ثَلٰثَۃِ اَیَّامٍ)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے کے آغاز میں تین روزے رکھا کرتے تھے اور کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ جمعہ کے دن روزہ نہ رکھیں۔

(ترمذی، نسائی ـــــ ابوداؤد سے یہ روایت ثلاثۃ ایام کے الفاظ تک ہے)

اِس حدیث میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی گزشتہ حدیث میں یہ آیا ہے اور دوسری احادیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ ہر مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے اور اسی چیز کی آپؐ نے ہدایت بھی فرمائی ہے لیکن اس حدیث میں یہ بات آئی ہے کہ آپؐ مہینے کے آغاز میں روزہ رکھا کرتے تھے۔

اِس اختلاف کی وجہ کیا ہے ـــــ اِس کی وجہ یہ ہے کہ نفلی روزہ کسی اعلان کے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ نہ آدمی خود اعلان کرتا ہے اور نہ کوئی لازمی موقع ایسا پیدا ہوتا ہے جس سے دوسروں کو یہ پتہ چل جائے کہ فلاں شخص روزے سے ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات خود بیوی تک کو یہ معلوم ہونا ضروری نہیں ہوتا کیونکہ اگر شوہر نے کہیں باہر دن گزارا ہے اور گھر آکر کھانا نہیں کھایا تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہوتا کہ لازماً اس نے کہیں باہر سے کھانا کھا لیا ہے ـــــ چنانچہ لازمی طور پر کسی شخص

کے روزے کا پتہ نہیں چل سکتا ــــــ اب جن لوگوں کو بعض آثار سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آج حضورؐ روزے سے ہیں تو وہ اپنی جگہ یہ رائے قائم کرتے تھے کہ نفلی روزوں کے بارے میں حضورؐ کا معمول یہ ہے۔ اس طرح ہر ایک کا اپنا اپنا قیاس اور اندازہ ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جو بات جس طرح کسی کے علم میں آئی اُس نے اُسی طرح سے بیان کر دی۔ چنانچہ اگر کسی کے علم میں یہ بات آئی کہ آپؐ تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کا روزہ رکھتے ہیں تو اس نے اسی کو بیان کیا۔ اگر کسی کے علم میں یہ آیا کہ آپؐ مہینے کے آغاز میں روزہ رکھتے ہیں تو اس نے اسی کو بیان کر دیا ــــــ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مہینے میں پندرہ پندرہ دن کے روزے رکھ لیتے ہوں۔ کبھی مہینے کے آغاز میں، کبھی درمیان میں اور کبھی جمعہ کو بھی۔ اس طرح یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی کہ حضورؐ مہینے میں صرف تین ہی دن کے روزے رکھتے تھے اور وہ فلاں فلاں تاریخ کے ہوتے تھے۔ اس لیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ بیان ان احادیث کے خلاف نہیں پڑتا جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضورؐ تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں کا روزہ رکھتے تھے اور نہ یہ بیان اُن احادیث کے خلاف پڑتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ حضورؐ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔

دوسری بات حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے یہ فرمائی ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ حضورؐ جمعہ کا روزہ نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس سے پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمعہ کے دن کو روزے کے لیے مخصوص کر لینے سے منع فرمایا تھا۔ غور کرنے سے یہ اشکال بآسانی رفع ہو سکتا ہے۔ چونکہ حضورؐ کا روزہ رکھنا اعلان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا اور عام پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا کہ آپؐ نے کس کس دن کا روزہ رکھا ہے اس لیے جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

کو یہ چیز بکثرت دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ آپؐ نے جمعہ کو روزہ رکھا ہے تو انھوں نے اپنے قیاس سے یہ رائے قائم کی کہ آپ جمعہ کو اکثر وبیشتر روزہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی قطعی رائے نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ حضورؐ پہلے سے روزے رکھتے چلے آرہے ہوں اور جمعہ کا روزہ بھی ان میں آگیا ہو اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے علم میں صرف جمعہ کا روزہ آیا ہو۔ اس لیے اُنھوں نے یہ سمجھا کہ حضورؐ بکثرت جمعہ کا روزہ رکھنے کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اس امکانی صورت کی موجودگی میں ان کا یہ بیان ان احادیث کے خلاف نہیں پڑتا جن میں التزام کے ساتھ جمعہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

نفلی روزوں کے بارے میں حضورؐ کا ایک اور طریقہ

۱۰۲۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ مِنَ الشَّهْرِ السَّبْتَ وَالْاَحَدَ وَالْاِثْنَيْنِ، وَمِنَ الشَّهْرِ الْاٰخَرِ الثُّلَاثَاءَ وَالْاَرْبِعَاءَ وَالْخَمِيْسَ۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مہینے ہفتہ، اتوار اور پیر کا روزہ رکھتے تھے اور دوسرے مہینے منگل، بدھ اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔ (ترمذی)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی جو روایت اس سے پہلے گزری ہے وہ اس سے بالکل مختلف کیوں ہے؟ —— اصل بات یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک مدت دراز یعنی تقریباً ۴۰، ۴۸ سال تک بقیدِ حیات رہیں۔ چونکہ لوگوں کو حضورؐ

کے معمولات، آپؐ کی ہدایات و احکام اور آپؐ کی زندگی کے حالات کی مستقل جستجو اور کھوج رہتی تھی اس لیے وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں سے سفر کر کے مدینہ آتے تھے اور خاص طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے کیونکہ ان کے متعلق لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زیادہ تفصیل سے جانتی اور بیان فرماتی ہیں۔ چنانچہ اس طویل مدت کے دوران میں مختلف اوقات میں بے شمار لوگوں نے آکر ان سے حضورؐ کے حالات دریافت کیے ہیں۔ اب چونکہ ہر حدیث میں ہر بات کا پس منظر تو بیان نہیں کیا جاتا بلکہ صرف اتنی بات مذکور ہوتی ہے جو اس حدیث کے باب کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو اس لیے اس چیز کا تعین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اصل مفصل گفتگو کیا ہوئی تھی جس کا ایک حصہ راوی نے روایت کیا ہے۔ اس بنا پر مختلف روایات کے اختلاف کو مختلف احوال و شئون کے لحاظ سے مختلف نوعیت کے جوابات اور بیانات پر محمول کیا جائے گا اور اسے تضاد قرار نہیں دیا جائے گا ـــــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی شخص کے پوچھنے پر یہ بتایا کہ حضورؐ پیر اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے تو وہ شخص وہی بات پلے باندھ کر لے گیا اور اس نے اسی کو جا کر روایت کیا۔ اسی طرح کسی دوسرے شخص نے کسی اور موقع پر حضرت عائشہؓ نے یہ ذکر کیا کہ حضورؐ کسی مہینے فلاں دنوں کے روزے رکھتے تھے اور کسی مہینے فلاں دنوں کے، اور اگر ایک مہینے میں ایک دفعہ تین دن کے روزے رکھ لیتے تھے تو پھر دوسرے مہینے میں دوسرے تین دنوں کے روزے رکھ لیتے تھے تاکہ ہر دو مہینوں میں ہفتے کا کوئی دن ایسا نہ ہو جس میں آپ نے روزہ نہ رکھا ہو، تو اس شخص نے اسی چیز کو روایت کیا ـــــــــــ

چنانچہ دراصل اس طرح کی مختلف روایات مختلف مواقع سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے متعلق یہ سوال اُٹھانا کوئی معقول بات نہیں کہ نفلی روزوں کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے علم میں حضورؐ کے جو مختلف معمولات آتے تھے انھوں نے وہ ہر گفتگو

میں ہر ایک کے سامنے سب کے سب کیوں نہ بیان فرما دیتے ــــــ ایسا ہی معاملہ دوسرے صحابہؓ کا ہے۔ ان سے بھی مختلف روایات مروی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والے لوگ ان سے بکثرت مسائل پوچھتے رہے۔ کسی سے دس سال تک پوچھتے رہے، کسی سے تیس سال تک اور کسی سے چالیس سال تک۔ اس طرح ان ہزاروں لوگوں نے مختلف صحابہؓ سے مختلف مواقع پر جو بات سُنی اُسے اُنھوں نے اسی طرح سے روایت کیا۔ یہ چیز کسی تضاد کا نہیں بلکہ اس اَمر کا ثبوت ہے کہ سننے والوں نے جو بات معلوم کی تھی اُنھوں نے اُسی کو آگے پہنچایا۔

نفلی روزوں کے متعلق حضرت اُمِّ سلمہؓ کو حضورؐ کی ہدایت

۱۰۳۔ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنِيْ اَنْ اَصُوْمَ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ اَوَّلُهَا الْاِثْنَيْنِ وَالْخَمِيْسُ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَالنَّسَائِیُّ)

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مہینے تین دن کے روزے رکھا کروں اور ان کی ابتدا پیر سے یا جمعرات سے کیا کروں۔ (ابوداؤد، نسائی)

اِس روایت کو گزشتہ روایات کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نفلی روزوں کے بارے میں مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہدایت ارشاد فرمائیں اِس سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ نفلی روزوں میں کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے۔ اگر حضورؐ نے ہر شخص کو چند مخصوص دنوں ہی میں روزہ رکھنے کے لیے کہا ہوتا تو یہی قانون بن جاتا اور پھر جو شخص بھی نفلی روزہ رکھتا اُنہی

دنوں میں رکھنا اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں کو مختلف طریقے بتائے تاکہ جب وہ جمع کئے جائیں تو معلوم ہو کہ اس سلسلے میں کوئی ایک ہی مقرر طریقہ نہیں ہے۔

کون سا شخص صائم الدہر ہے؟

۱۰۴۔ عَنْ مُسْلِمٍ الْقُرَشِيِّ قَالَ سَئَلْتُ اَوْ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صِيَامِ الدَّهْرِ فَقَالَ اِنَّ لِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، صُمْ رَمَضَانَ وَالَّذِيْ يَلِيْهِ وَكُلَّ اَرْبِعَاءَ وَخَمِيْسٍ فَاِذًا اَنْتَ قَدْ صُمْتَ الدَّهْرَ كُلَّهٗ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ)

حضرت مسلم قرشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے یا کسی اور شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صَوْمِ دَھر (یعنی ہمیشہ روزہ رکھنے) کے متعلق سوال کیا (کہ اس کا کیا حکم ہے؟) اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: تمہارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے۔ رمضان کے روزے رکھو اور اس سے ملحق مہینے یعنی شوال کے (چھ دنوں کے) روزے رکھو اور پھر ہر بدھ اور جمعرات کو بھی روزہ رکھ لیا کرو۔ اس طرح گویا تم ہمیشہ روزہ رکھنے والے شمار ہوگے۔

(ابوداؤد، ترمذی)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں چونکہ رہبانیت کا بہت زور تھا اس لیے اہلِ مذاہب میں راہب، سنیاسی اور جوگی وغیرہ قسم کے لوگ صَوْمِ

دھر کو بڑی فضیلت اور اہمیت دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ نیک آدمی وہ ہے جو صَائِمُ الدَّھر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ سے صَوْمِ دَھر کے متعلق بکثرت پوچھا گیا ہے اور آپؐ نے لوگوں کو بکثرت اس کے متعلق احکام بتائے ہیں ــــ پیشِ نظر حدیث کے مطابق جب آپؐ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے پوچھنے والے سے فرمایا کہ تمھارے بال بچوں کا بھی تم پر حق ہے۔ یعنی جو شخص صَوْمِ دَھر رکھتا ہے وہ بال بچوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا۔ اس سے پہلے ایک حدیث میں تفصیل سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ تمھارے نفس کا تم پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا، اور تمھارے پاس ملاقات کے لیے آنے والوں کا تم پر حق ہے اور صومِ دہری کے ساتھ یہ حقوق تم خوش اسلوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ اس طرح گویا حضورؐ نے عبادات کے سلسلے میں انتہا پسندی کا راستہ بند فرما دیا اور ہر ایسے شخص کے لیے جو فرائض سے زائد عبادت کرنا چاہتا ہے ایک اعتدال کا طریقہ مقرر فرما دیا۔

صَائِمُ الدُّھر بن کر بیٹھ رہنا اُن لوگوں کا کام ہے جنھیں دنیا اور اُس کے معاملات سے کوئی سروکار نہ ہو، اور ایسا وہی لوگ کر سکتے ہیں جو گوشوں میں جا کر بیٹھ رہیں لیکن جن لوگوں کو دنیا میں خدا کی خلافت کا حق ادا کرنا ہے وہ یہاں شادی بیاہ بھی کریں گے، بال بچوں کا بوجھ بھی اُٹھائیں گے، کاروبار اور تجارتیں اور ملازمتیں بھی کریں گے، عدالت کی کرسیوں پر بھی بیٹھیں گے اور حکومت کا کاروبار بھی چلائیں گے۔ غرض دنیا میں خلافتِ خداوندی کے جو کام ہیں وہ سب انھیں انجام دینے ہوں گے۔ ایسے لوگ صائم الدہر کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر صائم الدہر بننے والے شخص کے بارے میں انسان جس بڑی سے بڑی نیکی اور اَجر کی توقع کرتا ہے اس کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ ساری نیکی اور سارا اَجر ایک بندۂ مومن کو اس

صورت میں بھی حاصل ہو جائے گا جبکہ وہ اپنے باقی فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ رمضان کے فرض روزوں کے بعد شوال کے چھ روزے اور ہر مہینے بدھ اور جمعرات کے روزے بھی رکھ لے۔

اِس حدیث میں سائل کو بدھ اور جمعرات کا روزہ بتایا گیا۔ اس سے پہلے کسی کو پیر اور جمعرات کا روزہ بتایا گیا اور کسی کو بعض دوسرے دنوں کا۔ اس طرح مختلف لوگوں کو مختلف دنوں کے روزے بتائے گئے۔ گویا مختلف اشخاص کے لیے مختلف نسخے ہیں۔ وہ حکیم کہ جس کے پاس ہر مریض کے لیے ایک ہی لگا بندھا نسخہ ہوتا ہے کوئی دانا حکیم نہیں ہوتا۔ دانا حکیم تو وہ ہوتا ہے جو مریض کے مزاج، اس کے حالات، اس کے ماحول کی طبعی خصوصیات، ملکی آب و ہوا کے خصائص وغیرہ غرض ہر چیز کو سامنے رکھ کر نسخہ تجویز کرتا اور دوا اور خوراک مقرر کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔ بعینہٖ اسی طرح مختلف پوچھنے والوں میں سے ہر ایک کے حسبِ حال حضورؐ نے نفلی روزوں کے متعلق مختلف طریقے ارشاد فرمائے اور ان میں سے ہر طریقہ اپنی اپنی جگہ پر یکساں اجر و ثواب کا موجب ہے۔

میدانِ عرفات میں یومِ عرفہ کا روزہ رکھنا درست نہیں

۱۰۵۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ۔

(رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا تھا۔

(ابوداؤد)

اِس سے پہلے بعض احادیث میں یہ بات گزر چکی ہے کہ عرفہ کے دن کا روزہ بڑی فضیلت رکھتا ہے اور اس روزے کی فضیلت یہاں تک بیان ہوئی ہے کہ یہ ایک سال پہلے کے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر لوگ اس کی بہت پابندی کرتے تھے لیکن حضورؐ نے حاجیوں کو یہ روزہ رکھنے سے منع فرما دیا۔ پہلے بھی یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ حج ایک بڑی مشقت کا کام ہے اس لیے حضورؐ نے حالتِ حج میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا تھا۔ اصل میں آدمی کو ایک عبادت کا حق — جسے وہ انجام دے رہا ہو، پوری طرح ادا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ حج کر رہا ہے تو وہ حج ہی کا حق پوری طرح ادا کرے۔ حج کے اندر کٹوتی کر کے کچھ نفلی روزے کا بھی حق ادا کرنے کی کوشش کرنا، جس سے آدمی نہ پوری طرح حج کا حق ادا کر سکے اور نہ نفلی روزے کا، درست نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حج تو خود ایک بہت بڑی نیکی اور بڑا اہم فریضہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک نفلی عبادت بڑھا کر اپنے لیے ایسی مشقت پیدا کر لینا جس کی وجہ سے ایک شخص اس فریضے کے مناسک میں سے کوئی چیز چھوڑنے پر مجبور ہو جائے، کوئی معقول بات نہیں۔ یہاں تو دراصل نیکیوں میں بھی ایک توازن مطلوب ہے اور اسے ملحوظ رکھ کر ہی آدمی کو نیکی انجام دینی چاہیئے۔

ہفتہ کے دن کا روزہ رکھنا جائز نہیں

۱۰۶- عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بُسْرٍ عَنْ اُخْتِہِ الصَّمَّاءِ اَنَّ

رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَصُوْمُوْا یَوْمَ السَّبْتِ اِلَّا فِیْمَا افْتُرِضَ عَلَیْکُمْ، فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ اَحَدُکُمْ اِلَّا لِحَاءَ عِنَبَۃٍ اَوْ عُوْدَ شَجَرَۃٍ فَلْیَمْضَغْہُ

(رَوَاہُ اَحْمَدُ وَاَبُوْدَاؤدَ وَالتِّرْمِذِیُّ وَابْنُ مَاجَۃَ وَالدَّارِمِیُّ)

حضرت عبداللہ بن بُسر اپنی بہن صمّاء رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھو الّا یہ کہ ہفتہ اُس دن آجائے جس میں روزہ رکھنا تم پر فرض ہو۔ اگر کسی شخص نے غلطی سے ہفتے کے دن کا روزہ رکھ لیا ہو اور روزہ توڑنے کے لیے اسے انگور کا چھلکا یا کسی درخت کی چھال ہی مل جائے تو وہ اسی کو چبا کر روزہ توڑ دے۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

"جس دن میں روزہ رکھنا فرض ہو" کے الفاظ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ ہفتہ اگر رمضان کے اندر آجائے، جیسا کہ آتا ہے، تو کوئی حرج نہیں ہے اور اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اگر تمہیں رمضان کے روزوں کی قضا ادا کرنی ہے یا کفارے کے روزے رکھنے ہیں اور بیچ میں ہفتہ آرہا ہے تو اس کا روزہ رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن خاص طور پر سبت یعنی ہفتے کے دن کا قصد کر کے روزہ رکھنا درست نہیں۔ یہ ممانعت یہاں تک ہے کہ اگر کسی شخص نے غلطی سے ہفتے کا روزہ رکھ لیا ہو تو اُسے توڑ دینا چاہیے ——— یہ اس لیے کہ ہفتہ یہودیوں کے نزدیک مقدس دن ہے اور ان کے ہاں اس کا روزہ رکھنے کا التزام کیا جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ہفتے کے دن کو روزہ رکھنے کے لیے مخصوص کر لینا یا اس دن اکثر روزہ رکھنا، یا کبھی کبھار بھی اس کا انتخاب کر کے روزہ رکھنا ممنوع ہے اور اگر کسی شخص نے یہ روزہ رکھ ہی لیا ہو تو اسے چاہیے کہ توڑ دے۔ معلوم

ہوا کہ اس معاملے میں شدت ہے اور اس چیز کی اجازت نہیں ہے کہ اگر کسی نے غلطی سے روزہ رکھ لیا ہو تو وہ اُسے پورا کرے۔ یہ شدت اس لیے اختیار کی گئی کہ اہل اسلام اور یہود و نصاریٰ کے درمیان مشابہت پیدا نہ ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کو ایک اُمت کی حیثیت سے اپنا امتیاز قائم کرنا چاہیئے اور اسے سختی سے قائم رکھنا بھی چاہیئے۔ مسلمان ان امتیازی سرحدوں کو جتنا زیادہ دھندلا کرتے چلے جائیں گے اتنا ہی وہ یہود و نصاریٰ میں گم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان کے درمیان یہ تمیز کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ کون کیا ہے۔

خدا کی راہ میں ایک دن کے روزے کا غیر معمولی اجر

۱۰۷۔ عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، مَنْ صَامَ یَوْمًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جَعَلَ اللّٰهُ بَیْنَهٗ وَبَیْنَ النَّارِ خَنْدَقًا کَمَا بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ

(رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ)

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھے، اللہ تعالیٰ اُس کے اور دوزخ کے درمیان اتنی وسیع خندق حائل کر دیتا ہے جتنی آسمان اور زمین کی دوری ہے۔ (ترمذی)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو متعدد مرتبہ مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھے اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی آگ سے ستر سال کے فاصلے تک دور کر دیتا ہے۔ اس حدیث

کی وضاحت کرتے ہوئے فِي سَبِيْلِ اللهِ کا مطلب یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس سے جہاد فی سبیل اللہ بھی مراد ہے اور حج اور عمرے کا سفر بھی۔ اسی طرح علم دین کی تحصیل کیلئے سفر کرنا اور لوگوں کو اللہ کی راہ کی طرف دعوت دینے کے لیے نکلنا بھی "فی سبیل اللہ" کی تعریف میں آتا ہے۔ بہرحال جس آدمی کا سفر اللہ کی راہ میں ہو اور وہ اس حالت میں نفلی روزہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اسے اتنے بڑے اجر سے نوازے گا۔

یہ بات بھی پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ یہ احادیث اس غرض کے لیے نہیں بیان کی گئی ہیں کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ بس کسی ایک وقت میں تبلیغی سفر پر نکل گئے اور اس سفر میں ایک دن کا نفلی روزہ رکھ لیا تو اب ہمیشہ کے لیے جہنم سے خلاصی ہو گئی۔ ان احادیث کا یہ مفہوم مراد لینا درست نہیں ہے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ جو لوگ فی الواقع خدا کی طرف سے عاید کردہ فرائض بھی انجام دے رہے ہوں اور اللہ کی راہ میں اپنے اوقات اور محنتیں اور قابلیتیں بھی صرف کر رہے ہوں ان کے لیے ایک ایک نفلی عبادت کا اتنا کچھ اجر ہے۔

آسمان اور زمین کی دوری کے برابر خندق بنا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقعی خندق کھود دی جاتی ہے بلکہ اس کا مدّعا یہ ہے کہ اس شخص کے اور دوزخ کے درمیان ایک بہت بڑا فاصلہ حاصل کر دیا جاتا ہے اور وہ اسی قدر دوزخ سے محفوظ ہو جاتا ہے ——— آگے بھی اسی مضمون کی ایک حدیث آ رہی ہے جس میں دوسرے طریقے سے اس بات کو بیان کیا گیا ہے۔

سرما کا روزہ ——— غنیمتِ باردہ

۱۰۸- عَنْ عَامِرِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْغَنِيْمَةُ الْبَارِدَةُ الصَّوْمُ فِي الشِّتَاءِ (رواہ احمد والترمذی)

حضرت عامر بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جاڑے کے زمانے کا روزہ غنیمتِ بارِدہ ہے۔ (احمد، ترمذی)

غنیمتِ باردہ اس مال کو کہتے ہیں جو مفت میں ہاتھ آجائے اور اس کے لیے کوئی محنت ومشقت نہ کرنی پڑے۔ نہ تو اس پر کچھ خرچ اٹھے اور نہ اس کے لیے جان جوکھوں میں ڈالنی پڑے۔

جاڑے کے زمانے میں روزے کی نوعیت بھی مفت ہاتھ آئے ہوئے مال کی سی ہے کیونکہ اس میں کوئی زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑتی۔

یہاں اس روزے سے مراد رمضان کا روزہ بھی ہے اور نفلی روزہ بھی۔ رمضان کے روزے بھی آدمی کو مفت کا ثواب دلوادیتے ہیں اور نفلی روزوں کا بھی یہی معاملہ ہے، کیونکہ ان میں گرما کی سی سختی اور تکلیف سے سابقہ پیش نہیں آتا۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

عاشوراء کا روزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنّت ہے

۱۰۹- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ فَوَجَدَ الْيَهُوْدَ صِيَامًا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا هٰذَا الْيَوْمُ الَّذِيْ تَصُوْمُوْنَهٗ؟ فَقَالُوْا هٰذَا يَوْمٌ عَظِيْمٌ، اَنْجَى اللّٰهُ فِيْهِ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ وَغَرَّقَ فِرْعَوْنَ وَقَوْمَهٗ، فَصَامَهٗ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَنَحْنُ اَحَقُّ وَاَوْلٰى بِمُوْسٰى مِنْكُمْ فَصَامَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَمَرَ بِصِيَامِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ہجرت کے بعد) مدینہ تشریف لاتے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا: یہ کیسا دن ہے جس کا تم روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا یہ وہ عظیم الشان دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور آپ کی قوم کو نجات دلائی اور فرعون کو اور اس کی قوم کو غرق کر دیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس روز اللہ کا شکر ادا کرنے کیلئے روزہ رکھا کرتے تھے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تب ہم تم سے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام کے طریقے پر چلنے کے حق دار اور اہل ہیں۔ پھر حضورؐ نے اس دن کا روزہ رکھنا شروع کیا اور لوگوں کو بھی اس کا حکم دیا۔ (متفق علیہ)

اس بیان سے خود بخود یہ معلوم ہوا کہ یہ مدنی زندگی کے آغاز کی بات ہے اور اس وقت ابھی رمضان کے روزے فرض نہیں ہوتے تھے۔ نیز اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت نہیں آئی تھی کہ آپؐ یہود و نصاریٰ سے اپنا طریقہ الگ کرلیں۔ اس ہدایت کے آنے سے پہلے آپؐ کا طریقہ یہ رہا کہ جب تک کسی معاملے میں اللہ کا حکم نہ آتے اہلِ کتاب کے طریقے پر عمل کیا جاتے۔ یہ آپ کا معمول تھا اور اسی کی بنا پر آپؐ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے رہے تا آنکہ آپؐ کے پاس تحویلِ قبلہ کے احکام آ گئے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ شریعت میں بھی بعض دنوں کو یادگار کی حیثیت دی گئی ہے اور یادگار بنانے کے لیے اُن دنوں کا انتخاب کیا گیا ہے

جن میں اللہ تعالیٰ کا کوئی غیر معمولی نشان ظاہر ہوا جیسے یہی عاشوراء کا دن ہے کہ اس روز اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی قوم کو مصر سے نکالا اور ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون کو غرق کیا۔ چنانچہ یہ دن شریعتِ موسوی میں یادگار قرار پایا۔ اس یادگار کی یہ شکل مقرر نہیں کی گئی کہ اس میں مصر سے نکلنے کی کہانیاں اور قصے بیان کیے جائیں اور اس کو میلے ٹھیلے کا دن بنایا جائے بلکہ اس دن کا روزہ رکھنا طے کیا گیا ـــــ اسی طرح دیکھیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس روز اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کو قربان کرنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں دُنبہ دے کر قربانی کرائی، اس عظیم الشان تاریخی دن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا گیا اور تمام دنیا کے اہلِ ایمان کے لیے یہ طریقہ مقرر کر دیا گیا کہ وہ اس روز قربانی کر کے اس دن کی یاد تازہ کریں ـــــ اسی طرح جس مہینے میں قرآن نازل ہوا تھا اس پورے مہینے کو نزولِ قرآن کی یادگار بنا دیا اور اسی غرض کے لیے رمضان کے روزے مقرر کیے گئے ـــــ معلوم ہوا کہ شریعت یادگاروں کی اہمیت کو عملاً تسلیم کرتی ہے لیکن اس کے لیے وہ معیار اور آداب بھی خود مقرر کرتی ہے اور اس کے یہ معیار اور آداب اس کی حقیقی روح کی نمائندگی کرتے ہیں۔

حضورؐ کے ہفتہ اور اتوار کا روزہ اکثر رکھنے کی حکمت

۱۱۰- عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَصُوْمُ يَوْمَ السَّبْتِ وَيَوْمَ الْاَحَدِ اَكْثَرَ مَا يَصُوْمُ مِنَ الْاَيَّامِ وَيَقُوْلُ، اِنَّهُمَا يَوْمَا عِيْدٍ لِّلْمُشْرِكِيْنَ فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اُخَالِفَهُمْ۔ (رواہ احمد)

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم اپنے نفلی روزوں میں اکثر ہفتے اور اتوار کا روزہ رکھا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ مشرکین کی عید کے دن ہیں (یعنی اُن کے مقدس دن ہیں) اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کے خلاف عمل کروں۔ (احمد)

یہاں مشرکین سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں ہفتے کا دن یہودیوں کے ہاں اور اتوار کا دن عیسائیوں کے ہاں مذہبی تقدس کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہودیوں کے نزدیک ہفتے کا اور عیسائیوں (Practising Christians) کے نزدیک اتوار کا روزہ رکھنا نیکی ہے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ میں ان دونوں دنوں کا روزہ رکھ کر دونوں کے خلاف کرتا ہوں کیونکہ یہودی صرف ہفتے کے دن کا روزہ رکھتے ہیں اور اتوار کا نہیں رکھتے اور عیسائی صرف اتوار کا روزہ رکھتے ہیں ہفتے کا نہیں رکھتے۔ اس طرح اہل کتاب کے ہاں ان دونوں دنوں کی جس وجہ سے اہمیت تھی حضورؐ نے اسے برقرار بھی رکھا۔ لیکن دونوں کے طریقوں کو اپنایا بھی نہیں۔

حضورؐ صیام رمضان کی فرضیت سے پہلے عاشوراء کے روزے کی تاکید فرمایا کرتے تھے

۱۱۱- عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُ بِصِيَامِ يَوْمِ عَاشُوْرَاءَ وَيَحُثُّنَا عَلَيْهِ وَيَتَعَاهَدُنَا عِنْدَهُ، فَلَمَّا فُرِضَ رَمَضَانُ لَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا عَنْهُ وَلَمْ يَتَعَاهَدْنَا عِنْدَهُ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یومِ عاشوراء کے روزے کا حکم دیا کرتے تھے اور ہمیں اس پر اُبھارا کرتے تھے اور ہم سے دریافت کیا کرتے تھے

کہ کس کس نے روزہ رکھا ہے۔ پھر جب رمضان کے روزے
فرض کر دیئے گئے تو اس کے بعد نہ تو آپؐ نے ہمیں عاشوراء کے
دن کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، نہ اُس سے منع فرمایا اور نہ یہ پوچھا کہ
کس کس نے یہ روزہ رکھا ہے۔ (مسلم)

یَحُثُّنَا (یعنی ہمیں اُبھارتے تھے) کے الفاظ واضح کر دیتے ہیں کہ آپؐ
نے عاشوراء کے روزے کو فرض یا واجب قرار نہیں دیا تھا بلکہ بس وہ ایک
نیکی کا کام ہے جس پر حضورؐ لوگوں کو اُبھارتے تھے۔

یَتَعَاھَدُنَا عِنْدَہٗ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ ہم سے پوچھا کرتے تھے کہ بھئی
آج کس کس نے روزہ رکھا ہے۔ یہ بھی گویا اُبھارنے اور ترغیب دلانے کا ایک
طریقہ تھا جس سے لوگوں کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنا مقصود رہتا تھا۔

پھر حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رمضان کے روزے فرض کر دیئے
گئے تو اُس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو ہمیں عاشوراء کے دن کا روزہ
رکھنے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع کیا اور نہ پھر کبھی کسی سے پوچھا کہ آج کس نے روزہ
رکھا ہے۔ اِس طرح حضورؐ نے رمضان کی فرضیت کے بعد اس کی وہ پہلی اہمیت
ختم کر دی۔

چار کام جنھیں حضورؐ کبھی ترک نہیں فرماتے تھے

۱۱۲۔ عَنْ حَفْصَۃَ قَالَتْ اَرْبَعٌ لَمْ یَکُنْ یَدَعُھُنَّ النَّبِیُّ
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، صِیَامُ عَاشُوْرَاءَ وَالْعَشْرِ
وَثَلَاثَۃِ اَیَّامٍ مِّنْ کُلِّ شَھْرٍ وَرَکْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ۔
(رَوَاہُ النَّسَائِیُّ)

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چار کام ایسے ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ترک نہیں فرماتے تھے:

۱۔ عاشوراء کا روزہ ۲۔ ذی الحجہ کے پہلے عشرے کے روزے۔ ۳۔ ہر مہینے کے تین روزے اور ۴۔ فجر کے فرضوں سے پہلے دو رکعت سنّت۔ (نسائی)

اگرچہ حدیث کے متن میں عشر (دس) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے ذی الحجہ کے ابتدائی نو دن مراد ہیں کیونکہ دسواں دن تو عید الاضحیٰ کا ہے۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بیان سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی فجر کی سنّتیں ترک نہیں کیں۔ حضورؐ ان کا ہمیشہ التزام فرماتے تھے اور آپؐ نے ان کی بہت زیادہ تاکید بھی فرمائی ہے۔ اسی لیے جو سنّتیں فرض نمازوں کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیّت اور فضیلت انہی دو سنّتوں کی آئی ہے۔

نفلی روزوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف معمولات اور ان کی اہمیت کا تفصیلی ذکر گزشتہ احادیث میں آچکا ہے۔

حضورؐ ایامِ بیض کے روزے التزام سے رکھتے تھے

۱۱۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُفْطِرُ اَيَّامَ الْبِيْضِ فِيْ حَضَرٍ وَلَا سَفَرٍ۔ (رَوَاهُ النَّسَائِیُّ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایامِ بیض کے (یعنی تیرھویں، چودھویں

اور پندرھویں تاریخ کے) روزے کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔ خواہ آپؐ گھر پر مقیم ہوں، خواہ سفر میں ہوں۔ (نسائی)

اس سے پہلے بھی اس بات کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ حضورؐ کی نفلی عبادات کے متعلق جس صحابی کے علم میں جو بات آئی تھی وہ اس نے بیان کر دی۔ چونکہ حضرت ابن عباسؓ نے حضورؐ کو ایام بیض میں اکثر روزہ رکھتے ہوئے دیکھا اس لیے انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ آپ یہ روزے کبھی نہیں چھوڑتے تھے ــــ دوسرے صحابہؓ نے حضورؐ کو کسی اور چیز کا التزام کرتے دیکھا تو انھوں نے اسے اسی طرح سے بیان کیا۔ جس شخص نے دیکھا کہ حضورؐ کثرت سے کوئی کام کرتے ہیں تو اس نے اسے اس طرح بیان کیا کہ گویا آپ ہمیشہ یہ کام کرتے تھے۔ اسی وجہ سے حضورؐ کے نفلی روزوں کے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی تضاد درحقیقت نہیں ہے۔

روزہ جسم کی زکوٰۃ ہے

۱۱۴۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: لِکُلِّ شَیْءٍ زَکٰوۃٌ وَزَکٰوۃُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ (رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی زکوٰۃ ہے اور آدمی کے جسم کی زکوٰۃ روزہ ہے۔ (ابن ماجہ)

حقیقت میں تو تمام عبادتیں ایک لحاظ سے زکوٰۃ ہی کی تعریف میں آتی ہیں لیکن بطور اصطلاح صرف مال کی زکوٰۃ کو زکوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ زکوٰۃ

اصل میں یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا جو کچھ آپ کے پاس ہے اس پر اللہ کا حق تسلیم کریں اور اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کریں۔ چنانچہ روزہ آدمی کے جسم کی زکوٰۃ ہے اور اس زکوٰۃ کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ آپ روزہ اس احساس کے ساتھ رکھیں کہ میرے ربّ نے مجھ پر جو بے شمار احسانات کیے ہیں اور مجھے جسم جیسا عظیم الشان خادم عطا فرمایا ہے یہ روزہ میں اُس کے شکرانے کے طور پر رکھ رہا ہوں۔ اگر کسی شخص نے محض اپنی صحت درست کرنے کے لیے روزہ رکھ لیا تو وہ جسم کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ وہ جسم کی زکوٰۃ اُس وقت شمار ہوگا جبکہ وہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے جسم میں اُس کا حق مان کر رکھا جائے ——— اِسی طرح آپ کے اوقات کی زکوٰۃ ہے۔ جو وقت بھی آپ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے صرف کریں گے وہ لامحالہ آپ کے وقت کی زکوٰۃ ہوگی۔ اِسی طرح آپ کی قابلیتوں کی زکوٰۃ ہے۔ جو کچھ قابلیتیں اللہ نے آپ کو عطا کی ہیں اگر آپ ان کو خدا کا دین پھیلانے میں، لوگوں کو اس کے دین کا قائل کرنے میں، اور کفر و الحاد کا مقابلہ کرنے میں صرف کرتے ہیں تو یہ چیز آپ کی دماغی اور علمی قابلیتوں کی زکوٰۃ ہوگی ——— چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی آپ کو دی ہے اس پر اس کا حق ہے، اور جب آپ یہ حق ادا کرتے ہیں تو گویا اس چیز کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

پیر اور جمعرات کے نفلی روزوں کی فضیلت

۱۱۵۔ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَصُوْمُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ، فَقِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّکَ تَصُوْمُ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ، فَقَالَ اِنَّ یَوْمَ الْاِثْنَیْنِ وَالْخَمِیْسِ یَغْفِرُ اللّٰہُ فِیْھِمَا لِکُلِّ مُسْلِمٍ

اِلَّا ذَا ھَاجِرَیْنِ، یَقُوْلُ دَعْھُمَا حَتّٰی یَصْطَلِحَا

(رَوَاہُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَۃ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ آپؐ پیر اور جمعرات کا روزہ اکثر رکھتے ہیں؟ اس کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا، پیر اور جمعرات کے دن وہ ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ ہر مسلم کی مغفرت فرماتا ہے بجز اُن دو مسلمانوں کے جو ایک دوسرے کا مقاطعہ کئے ہوتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ (احمد، ابن ماجہ)

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکیمانہ طریق تعلیم کی ایک شاندار مثال ہے۔ ایک طرف تو حضورؐ نے اپنے اس فعل کی مصلحت بیان فرمائی اور دوسری طرف ایک عظیم الشان اخلاقی تعلیم دی۔

پہلی چیز جو فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہر پیر اور جمعرات کو ہر مسلم کی مغفرت فرماتا ہے تو اس میں لفظ مُسْلِم کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ لفظ مُسْلِم کو اس کے حقیقی معنی میں لیا جائے۔ یعنی وہ آدمی جو واقعی اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس نے اپنی پوری زندگی اللہ کی اطاعت میں دے رکھی ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے اسلام کا اقرار کر کے سچا ہے اسے قبول کر لیا ہے۔ اس پر بھی لفظ مسلم کا اطلاق ہوگا، قطع نظر اس سے کہ اس کی عملی زندگی میں کیا کچھ خامیاں اور خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہاں مسلم پہلے معنوں میں لیا جائے تو اس کی مغفرت کے معنی یہ ہوں گے کہ مسلم ہونے کے باوجود

انسانی کمزوریوں کی بنا پر اس سے جو لغزشیں اور خطائیں ہوتی ہیں وہ اس کی نفلی عبادات کے صلے میں آپ سے آپ معاف کردی جاتی ہیں۔

اگر یہاں مُسلِم دوسرے معنوں میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ محض اسلام قبول کرنے اور اسلام کو قطعی طور پر رد کر کے کفر پہ قائم رہنے میں بہرحال فرق ہے اور دونوں چیزوں کے الگ الگ نتائج ہیں۔ اگر ایک آدمی اسلام کو قطعی طور پہ رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں قرآن کو کتابِ ہدایت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول تسلیم نہیں کرتا اور اپنے کفر پہ (خواہ وہ عیسائیت ہو یا یہودیت یا کوئی اور مذہب) قائم رہتا ہے تو وہ لازماً باغی ہے۔ اس صورت میں اس کی کوئی نیکی نیکی نہیں ہے اور اس کے بارے میں کسی عملِ صالح کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی حکومت کے خلاف بغاوت کر دے تو وہ حکومت اس کے کسی فعل کو بھی مطابقِ قانون نہیں مانے گی۔ چاہے وہ خود دوسروں کو تعزیراتِ پاکستان کے مطابق سزائیں دیتا رہا ہو اور اس نے دوسروں پر "کرمنل پروسیجر کوڈ" ——— (Criminal Procedure Code) کے مطابق مقدمات چلائے ہوں، یا اسے "سول سروس کنڈکٹ رولز" کے تحت عدالت کا جج مقرر کیا گیا ہو اور وہ پورے ملکی قانون پر عمل پیرا رہا ہو۔ جب وہ بغاوت کے جرم میں پکڑا جائے گا تو حکومت اسے پوری سزا دے گی اور اُسے کوئی گنجائش یا اجر اس بات کا نہیں دے گی کہ یہ تو کرمنل پروسیجر کوڈ کے مطابق یا تعزیراتِ پاکستان کے مطابق کام کرتا رہا ہے اور تمام قوانین کا پابند رہا ہے ——— ایسا ہی معاملہ خدا کے اُس باغی کا ہے جس نے اسلام کو رد کر دیا اور کفر اور شرک پر قائم رہا ہے۔ اس کے کسی عمل کے عملِ صالح ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا سب کچھ کیا ہوا ضائع ہو جائے گا اور اسے اس کی بغاوت کی پوری پوری سزا بھی دی جائے گی ——— لیکن اگر کوئی آدمی اسلام

کو برحق مان لیتا ہے اور اس کی پیروی کا اقرار کر لیتا ہے تو اس طرح وہ گویا خدا کی وفادار رعایا میں شامل ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ کوئی گناہ یا قصور کرتا ہے تو وہ مجرم شمار ہو گا باغی نہیں۔ وہ اگر کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے اجر کا مستحق ہو گا اور اگر کوئی قصور کرتا ہے تو اس کی سزا کا مستوجب ہو گا۔ وہ اس دائرے سے نکل آیا ہے جس میں وہ خدا کا باغی تھا۔
اب اس صورت میں اس کے لیے اس کی چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر بھی اجر ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی بھر برائیوں میں مبتلا رہنے کے باوجود نیکی کا کوئی ایسا کام کر جائے جس سے اس کی بالکل معافی ہو جائے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی سخت گنہگار ہے لیکن ہے مومن اور مسلم۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسلام اور کفر کی جنگ پیش آجاتی ہے۔ اس حالت میں اس پر غیرتِ ایمانی غلبہ پاتی ہے اور وہ اللہ کے راستے میں جا کر لڑتا ہوا شہید ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کا وہ ایک ہی فعل اس کے تمام گناہوں کا معافی کا ذریعہ بن جائے گا۔ چنانچہ ایک مسلم کے لیے مغفرت کی بیسیوں شکلیں ہیں اور یہاں یہی فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلم کی مغفرت ہوتی ہے۔
مغفرت کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں کلی مغفرت کے اور دوسرے معنی ہیں جزوی مغفرت کے۔ کلی مغفرت یہ ہے کہ سارے قصور معاف کر دیئے جائیں اور جزوی مغفرت یہ ہے کہ اس کی ایک ایک نیکی ایک ایک گناہ کا بدلہ ہوتی چلی جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ برائیوں پر پکڑا ہی لیا جائے ــــ آخرت میں حساب لگایا جائے گا کہ اس آدمی نے کتنی نیکیاں کی ہیں اور کتنی بدیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں۔ اس کی نیکیوں کے حساب سے اس کی بدیاں چھانٹ دی جائیں گی۔ اگر اس کے بعد بھی بدیاں باقی رہ جائیں گی تو اس صورت میں اسے سزا ملنے کا سوال پیدا ہو گا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے اس کو سزا دیئے بغیر بخش دے۔

خدا کی خوشنودی کی خاطر ایک دن کا روزہ رکھنے کی فضیلت

۱۱۶۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ صَامَ یَوْمًا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ بَعَّدَهُ اللّٰهُ مِنْ جَهَنَّمَ كَبُعْدِ غُرَابٍ طَائِرٍ وَهُوَ فَرْخٌ حَتّٰی مَاتَ هَرِمًا۔

(رَوَاهُ اَحْمَدُ وَرَوَی الْبَیْهَقِیُّ فِیْ شُعَبِ الْاِیْمَانِ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ قَیْسٍ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ایک دن کا روزہ رکھا اللہ اُسے جہنم سے اتنے فاصلے تک دور کر دیتا ہے جتنا فاصلہ کہ ایک کوا اپنے پیدا ہونے کے بعد سے بوڑھا ہو کر مرنے کی عمر تک اُڑ کر طے کرتا ہے۔

(احمد۔ بیہقی)

اِس سے پہلے اس نوعیت کی مختلف احادیث گزر چکی ہیں جن میں سے ایک میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ اجر اُس شخص کے لیے ہے جس نے فی سبیل اللہ روزہ رکھا۔ اس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ اجر اس شخص کے لیے ہے جس نے اللہ کی خوشنودی کی خاطر روزہ رکھا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک شخص ایک نفلی روزہ رکھ لے اور اس کے نتیجے میں جب وہ جہنم سے اتنے بڑے فاصلے پر پہنچ جائے تو اُس کے بعد وہ یہ سوچنا شروع کر دے کہ اَب مجھے مزید عبادت کرنے اور مشقت اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے ــــــ درحقیقت یہ بات اُن لوگوں کے

لیے فرمائی ہی نہیں گئی جو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے فرار کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بات اُن لوگوں سے کہی گئی ہے جو ایک طرف تو پوری دلجمعی اور انہماک کے ساتھ فرائض کی ادائیگی کرنے والے تھے اور دوسری طرف اُنھیں مزید ایسے کاموں کی طلب رہتی تھی جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی اور زیادہ خوشنودی حاصل کر سکیں۔

اِس طرح کی احادیث کو دیکھ کر بعض لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جنھوں نے لوگوں کو بگاڑا ہے۔ حالانکہ انھیں معلوم نہیں کہ انھی حدیثوں نے درحقیقت اُس معاشرے کو بنایا تھا ـــــــ اُن لوگوں کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہر وقت بے تاب رہتے تھے۔ اُن لوگوں کو ایک ایک چیز بتائی گئی کہ یہ یہ کام کرو گے تو اِس پر اِس اِس اَجر کے مستحق ہو گے۔ چنانچہ وہ ایک ایک کام کی طرف لپکتے جاتے تھے اور ہر وقت اس بات کے حریص رہتے تھے کہ نیکی کا کوئی کام ایسا نہ رہ جائے جسے وہ انجام نہ دے سکے ہوں۔

بَابٌ

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

نفلی روزہ قبل از وقت افطار کرنے کے متعلق حضورؐ کے دو عمل

۱۱۷۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ هَلْ عِنْدَكُمْ شَيْءٌ فَقُلْنَا لَا، قَالَ فَإِنِّي إِذًا صَائِمٌ، ثُمَّ اَتَانَا يَوْمًا اٰخَرَ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُهْدِيَ لَنَا حَيْسٌ فَقَالَ اَرِيْنِيْهِ فَلَقَدْ اَصْبَحْتُ صَائِمًا فَاَكَلَ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور آپ نے دریافت فرمایا: کیا تمہارے پاس (کھانے کو) کچھ ہے؟ ہم نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: اچھا تو پھر میں روزہ رکھ لیتا ہوں —— پھر کسی دوسرے روز حضورؐ ہمارے ہاں تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں کچھ حیس[1] ہدیۃً بھیجا گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا اچھا لاؤ مجھے دکھاؤ، میں نے تو صبح روزہ رکھ لیا تھا۔ پھر آپؐ نے اسے تناول فرمایا۔ (مسلم)

اِس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] کھجور، گھی اور جمے ہوئے دودھ کو ملا کر ایک ملیدہ سا بنا لیا جاتا ہے، اسے حیس کہتے ہیں۔

علیہ وسلم نے گھر میں کھانا نہ ہونے کی وجہ سے روزہ رکھ لیا۔ پھر ایک اور دن ایسا ہوا کہ آپؐ نے یہ خیال کر کے کہ شاید گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوگا آپؐ نے روزہ رکھ لیا۔ بعد میں گھر میں کسی کے ہاں سے ہدیہ کے طور پر حیس آیا تو آپؐ نے اپنا روزہ کھول لیا اور اسے تناول فرمایا۔ یہ دونوں واقعات نفلی روزے سے متعلق ہیں۔ آگے اس سلسلے کی کچھ مزید احادیث آتی ہیں۔

نفلی روزے کی قضا کا مسئلہ

۱۱۸۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ دَخَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی اُمِّ سُلَیْمٍ فَاَتَتْہُ بِتَمْرٍ وَ سَمْنٍ، فَقَالَ اَعِیْدُوْا سَمْنَکُمْ فِیْ سِقَائِہٖ وَتَمْرَکُمْ فِیْ وِعَائِہٖ فَاِنِّیْ صَائِمٌ، ثُمَّ قَامَ اِلٰی نَاحِیَۃٍ مِّنَ الْبَیْتِ فَصَلّٰی غَیْرَ الْمَکْتُوْبَۃِ فَدَعَا لِاُمِّ سُلَیْمٍ وَ اَھْلِ بَیْتِھَا۔ (رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز (میری والدہ) اُمِّ سُلیم رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے تو وہ آپؐ کی خدمت میں کھجور اور گھی لے کر آئیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اپنا گھی برتن میں اور اپنی کھجوریں تھیلے میں واپس کر دو کیوں میں آج روزے سے ہوں ۔۔۔۔ پھر حضورؐ گھر کے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے اور آپؐ نے نفل نماز پڑھی۔ پھر آپؐ نے حضرت اُمِّ سُلیمؓ اور اُن کے گھر والوں کے لیے دُعا کی۔ (بخاریؒ)

حضرت اُمِ سُلیم رضؓ حضرت انسؓ کی والدہ تھیں۔ یہ خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت کرنے والا اور آپؐ کا بڑا خدمت گزار تھا۔ حضورؐ بھی اس خاندان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ حضرت انسؓ کو ان کے گھر والوں نے دس سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دے دیا تھا اور انھوں نے دس سال حضورؐ کی خدمت کی۔ اِن دیرینہ مراسم اور تعلقاتِ محبّت کی بنا پر حضورؐ اکثر اُن کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے ــــــ حضرت انسؓ ایسے ہی ایک موقع کا ذکر یہاں فرماتے ہیں۔

اِس طرح اَب دو مختلف حدیثیں آپؐ کے سامنے ہیں۔ ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ حضورؐ نے نفلی روزہ رکھا ہوا تھا، کھانا آیا تو آپؐ نے کھا لیا۔ اس حدیث میں یہ ہے کہ روزے کی حالت میں آپؐ کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا لیکن آپؐ نے کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں روزے سے ہوں ــــــ اِن دونوں حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حالت تو وہ تھی کہ حضورؐ نے گھر میں کھانا نہ ہونے کی وجہ سے روزے کی نیت کر لی لیکن جب دیکھا کہ گھر میں کھانا آگیا ہے تو روزہ کھول لیا۔ روزے کی نیت اس لیے کی کہ جب گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے تو بجائے اس کے کہ ویسے ہی فاقہ کیا جائے روزہ رکھ لینا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر ملے ــــــ دوسری حالت میں یہ ہوا کہ اس روز پہلے سے نفلی روزہ رکھنے کا ارادہ تھا اس لیے کھانا سامنے آنے کے باوجود روزہ افطار نہیں کیا ــــــ اِن دونوں حالتوں میں واضح فرق ہے۔ وہاں چونکہ روزہ اس وجہ سے رکھ لیا تھا کہ کھانا نہیں ہے اس لیے جب کھانا آگیا

تو کھا لیا، لیکن یہاں چونکہ پہلے سے روزہ رکھنے کا ارادہ تھا اس لیے کھانا آ بھی گیا لیکن نفلی روزہ ہونے کے باوجود افطار نہیں کیا۔

فقہاء کے درمیان نفلی روزے کی قضا کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کا قول مختلف احادیث کے پیش نظر یہ ہے کہ اگر ایک شخص نفلی روزہ توڑ دے اور کھانا کھا لے تو اس کی کوئی قضا نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی قضا ہے۔ اور امام مالکؒ کا قول یہ ہے کہ اگر آدمی بلا عذر روزہ توڑ دے تو اس کی قضا ہے لیکن اگر کسی معقول وجہ سے روزہ کھول لے تو اس کی قضا نہیں ہے۔

کھانے کی دعوت قبول کرنا مسنون ہے

۱۱۹۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ اِلٰی طَعَامٍ وَهُوَ صَائِمٌ فَلْیَقُلْ اِنِّیْ صَائِمٌ. وَفِیْ رِوَایَةٍ. قَالَ اِذَا دُعِیَ اَحَدُکُمْ فَلْیُجِبْ فَاِنْ کَانَ مُفْطِرًا فَلْیَطْعَمْ۔

(رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کسی شخص کو کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ روزے سے ہو تو اسے کہہ دینا چاہیے کہ میں روزے سے ہوں ـــــ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا، جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو اسے وہ دعوت قبول کر لینی چاہیے پھر اگر وہ روزے سے نہ

تو وہ نماز پڑھ لے اور اگر روزے سے نہ ہو تو کھانا کھا لے۔ (مسلم)

یہ جو فرمایا کہ فَلْيُصَلِّ، یعنی اگر وہ روزے سے ہو تو وہ نماز پڑھ لے، تو اس مقام پر اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دعوت کرنے والے کے حق میں دعا کرے۔ دوسرے یہ کہ جب لوگ کھانا کھانے لگیں تو یہ اس دوران میں نفل نماز پڑھے۔ یہ دونوں معنی عملاً اس طرح جمع ہو سکتے ہیں کہ آدمی نفل نماز بھی پڑھے اور دعوت دینے والے کے لیے دعا بھی کرے۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

نفلی روزہ قبل از وقت افطار کیا جا سکتا ہے

۱۲۰۔ عَنْ اُمِّ هَانِئٍ قَالَتْ لَمَّا كَانَ يَوْمُ الْفَتْحِ فَتْحِ مَكَّةَ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَجَلَسَتْ عَلٰى يَسَارِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاُمُّ هَانِئٍ عَنْ يَمِينِهٖ، فَجَاءَتِ الْوَلِيْدَةُ بِاِنَاءٍ فِيْهِ شَرَابٌ فَنَاوَلَتْهُ فَشَرِبَ مِنْهُ، ثُمَّ نَاوَلَهٗ اُمَّ هَانِئٍ فَشَرِبَتْ مِنْهُ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَقَدْ اَفْطَرْتُ وَكُنْتُ صَائِمَةً، فَقَالَ لَهَا اَكُنْتِ تَقْضِيْنَ شَيْئًا قَالَتْ لَا، قَالَ فَلَا يَضُرُّكِ اِنْ كَانَ تَطَوُّعًا۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَمَا اِنِّيْ كُنْتُ صَائِمَةً، فَقَالَ، اَلصَّائِمُ الْمُتَطَوِّعُ اَمِيْرُ نَفْسِهٖ، اِنْ شَاءَ صَامَ وَاِنْ شَاءَ اَفْطَرَ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالدَّارِمِيُّ وَاَحْمَدُ)

حضرت اُمِّ ہانیؓ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے روز (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے تو) حضرت فاطمہؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں

---

[1] یہ حضورؐ کی چچا زاد اور حضرت علیؓ کی سگی بہن تھیں۔

اور آپ کے بائیں جانب بیٹھ گئیں اور میں (یعنی اُمّ ہانی رضؓ) آپؐ کے
دائیں ہاتھ بیٹھی تھی۔ اتنے میں گھر کی ملازم لڑکی ایک برتن میں کچھ
پینے کے لیے لائی اور اسے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے
اسمیں سے نوش فرمالیا اور پھر آپؐ نے وہی برتن اُمّ ہانی رضؓ کو دے دیا۔
اُنھوں نے اس میں سے پی لیا اور پھر عرض کیا ، یارسول اللہ ، میں
نے روزہ کھول لیا ہے درآنحالیکہ میں روزے سے تھی۔ اس پر آپؐ
نے فرمایا کیا تم اپنے کسی پچھلے روزے کی قضا کر رہی تھیں ؟ اُنھوں نے
عرض کیا کہ نہیں تو آپؐ نے ارشاد فرمایا : اگر یہ نفلی روزہ تھا تو اس
(کے افطار کر لینے) میں تمھارے لیے کچھ مضائقہ نہیں ——
ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضرت اُمّ ہانی رضؓ نے
عرض کیا : یارسول اللہ ' میں تو روزے سے تھی۔ اِس پر آپؐ نے
ارشاد فرمایا : نفلی روزہ رکھنے والا اپنے نفس کا امیر (بادشاہ) ہوتا
ہے۔ اگر وہ چاہے تو روزہ رکھے (یعنی اس کی تکمیل کرے) اور
اگر چاہے تو افطار کرلے۔ (ابوداؤد ، ترمذی ، دارمی ، احمد)

ایک مرد مومن یا عورت کے لیے اس سے بڑھ کر عزت اور برکت کی
بات کیا ہوسکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی برتن میں پانی پی کر اُسے دے
دیا ہو۔ چنانچہ حضرت اُمّ ہانی رضؓ نے اسی شوق میں حضورؐ کا چھوڑا ہوا پانی پی لیا۔ لیکن
اس کے بعد یہ فکر ہوئی کہ آیا اس طرح روزہ افطار کرنا چاہیے تھا یا نہیں۔ اِس
لیے حضورؐ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ' میں تو روزے سے تھی۔ اس پر حضورؐ
نے ارشاد فرمایا کہ اگر نفلی روزہ تھا تو کوئی مضائقہ نہیں۔
معلوم ہوا کہ نفلی روزے میں وہ پابندی نہیں ہے جو فرض روزے میں

ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص فرض روزہ جان بوجھ کر توڑ دے تو اس کے کفارے کے طور پر اُسے ساٹھ روزے رکھنے ہوں گے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا۔ لیکن اگر نفلی روزہ کھول لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

"کوئی مضائقہ نہیں ہے" کے الفاظ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ نفلی روزہ کھول لینے پر کوئی کفارہ واجب نہیں آتا اور نہ اس کی کوئی سزا یا اس پر کوئی گرفت ہے۔ اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی قضا تو کرنا ہوگی لیکن روزہ کھول لینے کا کوئی گناہ نہیں۔ اس سلسلے میں فقہا کے درمیان جو اختلاف ہوا ہے وہ ان احادیث کے معنی کو دیکھ کر ہوا ہے اور اس اختلاف کی کوئی نہ کوئی بنیاد ہے۔ ہر ایک نے کسی نہ کسی چیز سے دلیل لی ہے اور کوئی فتویٰ بے دلیل نہیں دیا ہے۔

نفلی روزے کی قضا کا مسئلہ

۱۲۱۔ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُنْتُ اَنَا وَحَفْصَةُ صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ، فَقَالَتْ حَفْصَةُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا صَائِمَتَيْنِ فَعُرِضَ لَنَا طَعَامٌ اِشْتَهَيْنَاهُ فَاَكَلْنَا مِنْهُ، قَالَ اِقْضِيَا يَوْمًا اٰخَرَ مَكَانَهٗ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَاَبُوْدَاوٗدَ)

امام زہریؒ عروہؒ بن زبیر سے اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: میں اور حضرت حفصہؓ ایک مرتبہ روزے سے تھیں۔ اس حالت میں ہمارے سامنے

ایک ایسا کھانا پیش کیا گیا جو ہمیں بہت مرغوب تھا چنانچہ ہم دونوں نے اس میں سے کھا لیا ——— اس کے بعد حضرت حفصہؓ نے حضورؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ، ہم دونوں روزے سے تھیں لیکن ہمارے سامنے ایک ایسا کھانا پیش کیا گیا جو ہمیں بہت مرغوب تھا اس لیے ہم نے اس میں سے کھا لیا۔ اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اس کی قضا کرنے کے لیے اس کے بدلے میں کسی دوسرے دن کا روزہ رکھ لو۔ (ترمذی۔ ابوداؤد)

پچھلی حدیث میں فرمایا گیا تھا کہ تم اپنے نفس کے مالک ہو، چاہے نفلی روزہ رکھو چاہے نہ رکھو۔ اگر روزہ ہونے کے باوجود کھول لو تو کوئی مضائقہ نہیں یہاں یہ فرمایا گیا کہ اس کی قضا کرو۔ اس سلسلے کی احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "قضا کرو" کے الفاظ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں قضا کرنی چاہیئے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم نے روزہ کھول لیا ہے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ ہاں اگر تمہارے دل میں ملال ہے تو کسی دوسرے دن اس کی قضا کر لو، البتہ روزہ کھول لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے ——— خود یہ حدیث اس بارے میں واضح اور قطعی نہیں ہے کہ آیا قضا کرنے کے الفاظ حکم کی حیثیت رکھتے ہیں یا ان کا مطلب محض یہ ہے کہ اگر آدمی چاہے تو وہ دوسرے دن کا روزہ رکھ کر اس کی تلافی کر لے۔

فقہاء کے درمیان جو اختلافات ہوتے ہیں وہ عموماً ایسی احادیث اور آیات کے معانی متعین کرنے میں ہوئے ہیں اور یہ اختلافات بالکل فطری ہیں۔ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں کسی شخص کے پاس بھی ایسی کوئی قطعی دلیل نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ دوسرے کے قول کو غلط قرار دے سکے۔ البتہ ہر ایک کی دلیل ایسی ہوتی ہے جو اس کے نزدیک تو زیادہ مرجح ہوتی ہے لیکن دوسروں کے نزدیک

اس کا وہ وزن نہیں ہوتا اس لیے ایسے مواقع پر یہ کہنا درست نہیں ہوتا کہ فلاں کا قول یکسر غلط ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے لیے اس دعوے کے ساتھ اسے رد کرنا بھی صحیح نہیں ہوتا کہ وہ حدیث یا قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

نفلی روزہ رکھنے والے کی فضیلت

۱۲۲۔ عَنْ أُمِّ عُمَارَةَ بِنْتِ كَعْبٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، دَخَلَ عَلَيْهَا فَدَعَتْ لَهُ بِطَعَامٍ فَقَالَ لَهَا كُلِي فَقَالَتْ إِنِّي صَائِمَةٌ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الصَّائِمَ إِذَا أُكِلَ عِنْدَهُ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ حَتّٰى يَفْرُغُوا۔

(رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَةَ وَالدَّارِمِيُّ)

حضرت اُمِّ عُمارہ بنت کعب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کے سامنے کھانا پیش کیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تم بھی کھاؤ تو انھوں نے عرض کیا کہ میں روزے سے ہوں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر روزہ دار آدمی کے پاس کھانا کھایا جائے (اور وہ اسمیں شریک نہ ہو) تو فرشتے اس کے لیے اُس وقت تک دُعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں جب تک کہ لوگ کھانے سے فارغ نہ ہو جائیں۔

(احمد۔ ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

یہ ایک بہت بڑی بات ہے کہ آدمی نفلی روزہ رکھے ہوئے ہو اور یہ حق رکھتے ہوئے بھی کہ وہ روزہ کھول کر کھا پی سکتا ہے اپنا روزہ پورا کرے۔ دوسرے لوگ

اس کے سامنے کھا پی رہے ہوں لیکن وہ روزے سے رہے۔ اس کے اندر صبر اور ضبطِ نفس کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے دل میں اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا جو جذبہ کارفرما ہے اس کی وجہ سے ملائکہ برابر اس کے حق میں دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

الفصل الثالث

نفلی روزہ رکھنے کا اجر

۱۲۳۔ عَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَتَغَدّٰى، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، اَلْغَدَاءَ يَا بِلَالُ، قَالَ اِنِّيْ صَائِمٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَاْكُلُ رِزْقَنَا وَفَضْلُ رِزْقِ بِلَالٍ فِي الْجَنَّةِ، اَشَعَرْتَ يَا بِلَالُ اَنَّ الصَّائِمَ تُسَبِّحُ عِظَامُهٗ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُ الْمَلَائِكَةُ مَا اُكِلَ عِنْدَهٗ۔ (البیہقی)

حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضورؐ اس وقت دن کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا بلال رضی اللہ عنہ آؤ کھانے میں شریک ہو جاؤ۔ اُنھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ، میں روزے سے ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا بہترین رزق جنت میں ہے۔ اے بلال رضی اللہ عنہ تمھیں معلوم ہے کہ جب تک لوگ روزہ دار کے پاس کھانا کھاتے رہتے ہیں اس کی ہڈیاں تسبیح میں لگی ہوتی ہیں اور ملائکہ اس کے لیے دُعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔ (بیہقی)

یہ چیز کہ ایک آدمی کو کھانے کے لیے بلایا جائے اور کھانا سامنے موجود ہونے کے باوجود وہ اپنا نفلی روزہ پورا کرے، اتنا بڑا اجر رکھتی ہے کہ اس شخص کے لیے کھانا جنّت میں محفوظ کر دیا جاتا ہے اور جتنی دیر تک لوگ اس کے پاس بیٹھے کھاتے رہیں اتنی دیر تک اس کی ہڈیاں تسبیح میں لگی ہوتی ہیں اور ملائکہ اس کے لیے استغفار کر رہے ہوتے ہیں۔

بَابُ لَیْلَةِ الْقَدْرِ

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے

۱۲۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: تَحَرَّوْا لَیْلَةَ الْقَدْرِ فِی الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ (رَوَاهُ الْبُخَارِیُّ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس راتوں کی طاق تاریخوں (یعنی اکیس[21]، تیئس[23]، پچیس[25]، ستائیس[27] اور انتیس[29] تاریخوں) میں تلاش کرو۔ (بخاریؒ)

لَیْلَةُ الْقَدْرِ اُس خاص رات کا نام نہیں ہے بلکہ اسکی صفت ہے چونکہ قرآنِ مجید اس خاص رات میں نازل کیا گیا تھا اس لیے اس کو قدر کی رات کہا گیا۔

قدر سے کیا مراد ہے؟

قدر کے کئی معنی ہو سکتے ہیں ایک معنی یہ ہیں کہ وہ رات بہت ہی احترام کے قابل اور بڑی عظمت والی ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس کے علاوہ قدر کا لفظ قضا و قدر کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ (ملائکہ اور جبرئیلؑ اس رات میں اپنے رب کے حکم سے ہر طرح کے احکام و فرامین لے کر نازل ہوتے ہیں) چنانچہ اس کے معنی تقدیر بنانے کی رات کے بھی ہو سکتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قدر کو ضیق اور تنگی کے

معنوں میں لیا ہے اور وہ لیلۃ القدر کا مفہوم قرار دیتے ہیں کہ اس معاملے میں اللہ نے تنگی کی ہے کہ اس کی صحیح تاریخ لوگوں کو بتائی جاتے۔ لیکن یہ ایک دُور کا مفہوم ہے۔

لیلۃ القدر کے متعلق یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ رمضان کی کون سی رات ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے وہ بس یہ ہے کہ وہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے۔ اس لیے اسے انہی راتوں میں تلاش کرو۔

لیلۃُ القدر کا قطعی طور پر تعیُّن نہ کرنے میں یہ حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ آدمی ہر طاق رات میں اس اُمید پر اللہ کے حضور میں کھڑا ہو کر عبادت کرے کہ شاید یہی لیلۃ القدر ہو —— لیلۃ القدر اگر اُس نے پالی تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ جس چیز کا وہ طالب تھا وہ اُسے مل گئی۔ اب اس کے بعد اس نے جو چند مزید راتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں تو وہ اس کی نیکی میں اور اضافے کا باعث بنیں گی۔

لیلۃُ القدر کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا خواب

۱۲۵۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ إِنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُرُوا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْمَنَامِ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا فَلْيَتَحَرَّهَا فِي السَّبْعِ الْأَوَاخِرِ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صحابہ کو خواب میں دکھایا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان کی آخری سات تاریخوں میں ہے۔ جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی گئی تو آپ نے فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگوں کے خواب رمضان کے آخری سات دنوں کے بارے میں متفق ہو گئے ہیں۔ پس اب جو شخص لیلۃ القدر کی تلاش کرے تو وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرے (متفق علیہ)

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جو متعدد احادیث ایک دوسرے سے مختلف آئی ہیں ان کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کوئی حدیث زمانی اعتبار سے پہلے کی ہو اور کوئی بعد کی۔ کیونکہ راویوں نے احادیث کی روایت کرتے وقت ان کا زمانہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس حدیث میں بھی ایسا کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں تلاش کرو۔ یہاں بہت سے صحابہؓ کے ایک خواب کا ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق وہ رمضان کی آخری سات تاریخوں میں سے کوئی رات ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ کئی صحابہ کو ایک ہی خواب نظر آیا ہے یہ فرمایا کہ اب لیلۃ القدر کو رمضان کی آخری سات تاریخوں میں تلاش کرو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت پہلے کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی بعد کی ہے (واللہ اعلم بالصواب) ایسی احادیث کو یہ کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ باہم متضاد ہیں بلکہ درحقیقت ان میں اختلاف ترتیب زمانی کی تقدیم و تاخیر کی وجہ سے ہوا ہے اور اس نوع کا اختلاف ان کو متضاد یا غلط قرار دیئے جانے کی

دلیل نہیں بن سکتا۔

لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کی ہدایت

۱۲۶- عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِلْتَمِسُوْھَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ فِیْ تَاسِعَۃٍ تَبْقٰی، فِیْ سَابِعَۃٍ تَبْقٰی، فِیْ خَامِسَۃٍ تَبْقٰی۔ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لیلۃ القدر کو تلاش کرو رمضان کی آخری دس تاریخوں میں یعنی اکیس[۲۱] یا انیس[۲۹] کو، تیئیس[۲۳] یا ستائیس کو یا پچیس[۲۵] کو۔

(بخاری)

حدیث کے متن میں فِیْ تَاسِعَۃٍ تَبْقٰی کے اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آئے ہیں، یہ دراصل عربی زبان میں اعداد بیان کرنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ اگر ان کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو مفہوم خبط ہو جائے گا۔ عربوں میں چونکہ لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا اس لیے وہ اپنا حساب کتاب عام طور پر انگلیوں سے کیا کرتے تھے اور ان کے ہاں اعداد بیان کرنے کے بعض دوسرے طریقے بھی رائج تھے۔ انہی میں سے ایک خاص طریقہ یہ بھی تھا جس کے مطابق یہاں گنتی کر کے تاریخوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

حدیث کے متن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کا زمانہ بھی وہی ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں آخری عشرے کی طاق راتوں کا ذکر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے لیکن حضرت

ابن عباسؓ کی روایت میں تاریخوں کی صراحت بھی موجود ہے کہ لیلۃ القدر کو آخری عشرے کی ان راتوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس طرح یہ حدیثیں باہم مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہیں، بلکہ دراصل ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں۔

لیلۃ القدر کی تلاش میں حضورؐ کا پورا رمضان اعتکاف میں گزرنے کا واقعہ

۱۲۷۔ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ ِالْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِعْتَکَفَ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ مِنْ رَمَضَانَ ثُمَّ اعْتَکَفَ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ فِیْ قُبَّۃٍ تُرْکِیَّۃٍ ثُمَّ اَطْلَعَ رَأْسَہٗ فَقَالَ اِنِّیْ اعْتَکَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوَّلَ اَلْتَمِسُ هٰذِهِ اللَّیْلَۃَ ثُمَّ اعْتَکَفْتُ الْعَشْرَ الْاَوْسَطَ ثُمَّ اُتِیْتُ فَقِیْلَ لِیْ اِنَّهَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فَمَنْ کَانَ اعْتَکَفَ مَعِیْ فَلْیَعْتَکِفِ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ فَقَدْ اُرِیْتُ هٰذِهِ اللَّیْلَۃَ ثُمَّ اُنْسِیْتُهَا وَقَدْ رَاَیْتُنِیْ اَسْجُدُ فِیْ مَاءٍ وَّطِیْنٍ مِنْ صَبِیْحَتِهَا فَالْتَمِسُوْهَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ وَالْتَمِسُوْهَا فِیْ کُلِّ وِتْرٍ. قَالَ فَمَطَرَتِ السَّمَاءُ تِلْکَ اللَّیْلَۃَ وَکَانَ الْمَسْجِدُ عَلٰی عَرِیْشٍ فَوَکَفَ الْمَسْجِدُ فَبَصُرَتْ عَیْنَایَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰی جَبْهَتِهٖ اَثَرُ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ مِنْ صَبِیْحَۃِ اِحْدٰی وَعِشْرِیْنَ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ فِی الْمَعْنٰی) ——— دَلِّیْ

وِرَایَۃِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اُنَیْسٍ قَالَ لَیْلَۃُ ثَلَاثٍ وَعِشْرِیْنَ۔
(رَوَاہُ مُسْلِمٌ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے پہلے دس دن اعتکاف کیا۔ پھر ایک مرتبہ آپؐ نے ایک ترکی طرز کے خیمے کے اندر رمضان کے درمیانی دس دن اعتکاف کیا۔ اعتکاف ختم ہونے پر آپؐ نے اپنا سر مبارک خیمے سے باہر نکالا اور فرمایا: میں نے اس رات کی تلاش میں پہلے دس دن کا اعتکاف کیا۔ پھر میں نے بیچ کے دس دن کا اعتکاف کیا۔ تب میرے پاس آنے والا آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے۔ پس جو لوگ میرے ساتھ اعتکاف میں بیٹھے تھے انھیں چاہیئے کہ وہ اب آخری دس دن بھی اعتکاف کریں ـــــ مجھے یہ رات (لیلۃ القدر) دکھائی گئی تھی مگر پھر بھلا دی گئی اور میں نے یہ دیکھا کہ میں اس رات کی صبح کو پانی اور مٹی میں (برسات کی وجہ سے) نماز پڑھ رہا ہوں۔ پس تم لوگ اسے رمضان کے آخری دس دنوں کی طاق تاریخوں میں تلاش کرو ـــــ اس کے بعد حضرت ابو سعید خدریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک رات کو (جس کا وہ ذکر رہے ہیں) بارش ہوئی اور مسجد نبوی ایک ایسے چبوترے پر تھی جس پر کھجوروں کے پتوں کا چھپر تھا (اور نیچے مسجد میں کوئی فرش نہیں تھا)۔ بارش کی وجہ سے مسجد رات کو ٹپکی اور میری آنکھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اکیسویں تاریخ کی صبح کو آپ کی پیشانی مبارک پر پانی

اور شی کا نشان تھا ـــــــ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ مفہوم کے لحاظ سے اس حدیث پر متفق ہیں اور حضرت عبداللہؓ بن انیس نے اپنی روایت میں یہ الفاظ کہے ہیں کہ یہ رات تیئسویں[۲۳] تھی۔ اِسے امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔

رمضان کے مختلف حصّوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتکاف بیٹھنے کے واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ لیلۃ القدر کو تلاش کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے آپؐ نے رمضان کے پہلے دس دن اعتکاف کیا۔ پھر بیچ کے دنوں میں کیا۔ پھر آپؐ کو اشارہ کیا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری دس دنوں میں ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اُن صحابہ سے جو آپؐ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھے تھے یہ فرمایا کہ تم بھی آخری دس دنوں میں اعتکاف کرو۔

حدیث کے متن میں اِنِّی اُنْسِیْتُھَا کے الفاظ آئے ہیں جن کا ترجمہ ہے کہ "وہ رات مجھے بھلا دی گئی" یہ نہیں فرمایا کہ میں بھول گیا۔ اس جگہ ایک نازک نکتہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز بطور ہدایت نازل ہو یا کسی چیز کا علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسولؐ کو دیا گیا ہو اور وہ اسے بھول جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نعوذ باللہ رسالت محفوظ نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا ہونا بعید از عقل و امکان ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلا دیا جائے تو اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کے ذہن سے جس بات کو چاہے محو کر دے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر کام کے کرنے کا اختیار رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے کئے ہوئے کسی کام کو محو کر دینے اور منسوخ کر دینے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ علم اپنے نبیؐ سے چھپایا بھی نہیں لیکن اس کو ظاہر کرنے کے بعد اس کے ذہن سے اس کو محو بھی کر دیا تا کہ جس چیز کی خبر اللہ تعالیٰ لوگوں کو نہیں دینا چاہتا تھا

وہ لوگوں تک نہ پہنچے۔ اسی لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اِنِّیْ اُنْسِیْتُھَا وہ رات مجھے بھلا دی گئی[1]۔

اب یہ سوال کہ راویٔ حدیث حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ کے اخذ کردہ اس نتیجے کی حقیقت کیا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کی اکیسویں رات ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا تھا کہ مجھے خواب میں جو چیز دکھائی گئی ہے وہ یہ تھی کہ وہ کوئی بارش والی رات ہے اور صبح کو میں نے کیچڑ میں سجدہ کیا ہے[2] اس لیے جب لوگوں نے دیکھا کہ اکیس تاریخ کو بارش ہوئی ہے اور صبح کی نماز کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر پانی اور مٹی کا نشان تھا تو لوگوں نے خیال کیا کہ حضورؐ کی بتائی ہوئی بات کے مطابق یہی رات لیلۃ القدر ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ نہیں فرمایا کہ یہی

---

[1] ایک اور حدیث کی تشریح کرتے ہوئے مولانائے محترم نے اس بات کی وضاحت یوں فرمائی، یہ ممکن نہیں ہے کہ رسولؐ کو دین کے معاملے میں نسیان لاحق ہو جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے: سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعلیٰ ۹) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ ہم تم کو بذریعہ وحی جو کچھ پڑھوا رہے ہیں تم اسے بھولو گے نہیں بجز اس کے کہ جو اللہ خود چاہے ــــــ مزید ارشاد ہوا کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (البقرہ ۱۰۶) یعنی ہم اپنی جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس کی جگہ اس سے بہتر لاتے ہیں یا کم از کم ویسی ہی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ــــــ
تو اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے لیلۃ القدر کا علم دیا لیکن پھر بھلا دیا، اور وہ اس بات کا پورا اختیار رکھتا ہے۔

[2] اس زمانے میں مسجد نبویؐ کا فرش پختہ نہیں تھا بلکہ خالی زمین پر کنکریاں ڈال دی گئی تھیں اور بارش سے کیچڑ ہو جاتی تھی۔

اکیسویں رات لیلۃ القدر ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے خود یہ قیاس کیا کہ یہی رات لیلۃ القدر ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کو کوئی اور رات دکھائی گئی ہو کیونکہ عبداللہ بن اُنیسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ تیئسویں رات تھی۔ چنانچہ اس طرح بھی ۱۲ تاریخ کا قطعی تعین نہیں ہوا ——— اس طرح دراصل حکمتِ الٰہی کا یہ مقصود کہ لوگوں کو ٹھیک ٹھیک اس رات کی تاریخ کا علم نہ ہو روایات کے اختلاف نے پورا کر دیا۔ نہ روایات متفق ہو سکیں اور نہ خود رسول اللہ ہی نے یہ وضاحت فرمائی کہ یہی وہ رات ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی۔

رمضان کی ستائیسویں شب کے لیلۃ القدر ہونے کے متعلق ایک روایت

۱۲۸ - عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ قَالَ سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ فَقُلْتُ إِنَّ أَخَاكَ ابْنَ مَسْعُوْدٍ يَقُوْلُ مَنْ يَقُمِ الْحَوْلَ يُصِبْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ، فَقَالَ رَحِمَهُ اللّٰهُ أَرَادَ أَنْ لَا يَتَّكِلَ النَّاسُ أَمَا إِنَّهُ قَدْ عَلِمَ أَنَّهَا فِي رَمَضَانَ وَ أَنَّهَا فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ وَ أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ ثُمَّ حَلَفَ لَا يَسْتَثْنِيْ أَنَّهَا لَيْلَةُ سَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ فَقُلْتُ بِأَيِّ شَيْءٍ تَقُوْلُ ذٰلِكَ يَا أَبَا الْمُنْذِرِ قَالَ بِالْعَلَامَةِ أَوْ بِالْآيَةِ الَّتِيْ أَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهَا تَطْلُعُ يَوْمَئِذٍ لَا شُعَاعَ لَهَا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت زِرّ بن حُبیش (جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے خاص شاگرد

تھے) بیان کرتے کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کے بھائی حضرت ابن مسعودؓ تو کہتے ہیں کہ جو شخص سال بھر (راتوں کو) قیام کرے گا وہ لیلۃ القدر کو پالے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ یعنی اُنھوں نے تو رمضان تک کا ذکر چھوڑ دیا ہے کجا کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کا ذکر کرتے)۔ حضرت اُبی بن کعبؓ نے جواب دیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اُن کی مراد دراصل یہ تھی کہ لوگ ایک خاص تاریخ یا خاص زمانے پر بھروسہ نہ کرلیں (اور سال بھر کی راتوں کی عبادت سے غافل نہ ہو جائیں) ورنہ اُنھیں معلوم تو تھا کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے، اور اُنھیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں ہے، اور یہ بھی کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ پھر حضرت اُبَی بن کعبؓ نے بغیر استثناء کیے ہوئے حلفاً یہ کہا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں تاریخ ہے۔ پس میں نے پوچھا کہ اے ابو منذر، (حضرت اُبیؓ بن کعب کی کُنیت) آپ یہ بات کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا: ایک علامت یا نشانی کی بنا پر کہہ رہا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائی تھی اور وہ نشانی یہ ہے کہ اس روز جو سورج نکلے گا اس میں شعاع نہیں ہوگی۔ (مسلمؒ)

"شعاع نہیں ہوگی" سے مراد یہ ہے کہ شعاع میں تیزی نہیں ہوگی۔ ایسا اس بنا پر بھی ہوسکتا ہے کہ بادل ہونے کی وجہ سے سورج کی شعاعیں بہت ہلکی اور دھیمی ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس روز ویسے ہی شعاعوں میں تیزی اور چمک کم ہو ۔۔۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس علامت سے قطعی طور پر لیلۃ القدر کا تعین کیا جا

سکتا ہے؟

حضرت اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ نے اوّل تو اپنے اجتہاد سے یہ رائے قائم کی کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علامت بتائی ہے اور فلاں تاریخ کو (جو ستائیسویں تھی) میں نے یہ علامت دیکھی ہے اس لیے ضرور یہ ستائیسویں تاریخ ہی لیلۃ القدر کی تاریخ ہو گی، حالانکہ کسی اور تاریخ کو بھی سورج نکلنے کی یہ کیفیت ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ خود لَاشُعَاعَ لَهَا کے الفاظ بھی اس بات کا قطعی طور پر تعین نہیں کرتے کہ سورج کے طلوع ہونے کی کس کیفیت کا نام لَاشُعَاعَ لَهَا ہے۔ اس بنا پر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمیشہ کے لیے ستائیسویں تاریخ کا تعین کر دیا جائے یا کسی اور تاریخ کو کھڑے ہو کر ایک آدمی یہ دیکھے کہ آج سورج کی شعاع کیسی پڑ رہی ہے اور وہ اپنی جگہ یہ خیال کرے کہ یہ لَاشُعَاعَ لَهَا کی کیفیت ہے یہ طے کر دے کہ آج کی تاریخ وہ خاص تاریخ ہے ـــــــ یہاں بھی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت کس طرح پوری ہو رہی ہے کہ لوگوں کو یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ لیلۃ القدر کون سی رات ہے۔

عشرۂ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام عبادات

۱۲۹- عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْتَهِدُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِيْ غَيْرِهٖ۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں (اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں) جس قدر سخت محنت کرتے تھے اتنی اور کسی زمانے میں نہیں

کرتے تھے۔ (مسلم)

رمضان کے عشرۂ آخر میں حضور کا اہتمام عبادات

۱۳۰۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ شَدَّ مِئْزَرَهٗ وَاَحْيٰى لَيْلَهٗ وَاَيْقَظَ اَهْلَهٗ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب رمضان کی آخری دس تاریخیں آتی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمربستہ ہو جاتے تھے۔ رات رات بھر جاگتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔

(متفق علیہ)

ویسے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالانے میں ہمیشہ انتہائی محنت کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ رض کے بیان کے مطابق رمضان کے آخری دس دنوں میں آپ کی محنت بہت زیادہ بڑھ جاتی تھی۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِیْ

لیلۃ القدر کی دعا

۱۳۱۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ عَلِمْتُ اَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا اَقُوْلُ فِيْهَا، قَالَ قُوْلِيْ، اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ۔ (رَوَاهُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ وَالتِّرْمِذِيُّ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ، آپ کا کیا خیال ہے، اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کون سی رات لیلۃ القدر ہے، تو مجھے اس میں کیا کہنا

چاہیئے؟ آپؐ نے فرمایا: یوں کہو کہ اے میرے خدا، تو بڑا معاف کرنے والا ہے، تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے، لہذا مجھے معاف فرمادے۔ (احمدؒ، ابن ماجہ، ترمذی)

لیلۃ القدر کو رمضان کے عشرۂ آخر کی طاق راتوں میں تلاش کرنے کی ہدایت

۱۳۲۔ عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: اِلْتَمِسُوْھَا یَعْنِیْ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ فِیْ تِسْعٍ یَبْقَیْنَ اَوْ فِیْ سَبْعٍ یَبْقَیْنَ اَوْ فِیْ خَمْسٍ یَبْقَیْنَ اَوْ ثَلَاثٍ اَوْ اٰخِرِ لَیْلَۃٍ (رَوَاہُ التِّرْمِذِیُّ)

حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: لیلۃ القدر کو تلاش کرو (رمضان کی) ۲۱ یا ۲۳ یا ۲۵ یا ۲۷ یا ۲۹ تاریخ کی رات کو۔ (ترمذی)

اس سے پہلے بھی یہ بات بہ تکرار گزر چکی ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرے میں ہے، طاق راتوں میں ہے اور آخری عشرے کی طاق راتیں یہی ہیں، یعنی اکیسویں، تیئسویں، پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں۔

لیلۃ القدر ہر رمضان میں ہوتی ہے

۱۳۳۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ، فَقَالَ ھِیَ فِیْ کُلِّ رَمَضَانَ۔

(رَوَاہُ اَبُوْ دَاؤد)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے لیلۃ القدر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ رمضان میں ہوتی ہے۔ (ابوداؤد)

جس رات میں قرآن نازل کیا گیا تھا اور جس کو قرآن مجید میں لیلۃ القدر کہا گیا ہے چونکہ وہ رمضان کی ایک رات تھی اس لیے لازماً ہر رمضان میں ایک رات لیلۃ القدر ہے۔ لیکن کونسی رات ہے اس کا تعین نہیں ہو سکا، بجز اس کے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی رات ہے۔

حضرت عبداللہ بن اُنیس کو ہر ماہ کی تیئسویں شب مسجد نبوی میں گزارنے کی نصیحت

۱۳۴ - عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اُنَيْسٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِیْ بَادِيَةً اَكُوْنُ فِيْهَا وَاَنَا اُصَلِّیْ فِيْهَا بِحَمْدِ اللّٰهِ فَمُرْنِیْ بِلَيْلَةٍ اَنْزِلُهَا اِلٰی هٰذَا الْمَسْجِدِ، فَقَالَ اَنْزِلْ لَيْلَةَ ثَلَاثٍ وَعِشْرِيْنَ قِيْلَ لِابْنِهٖ كَيْفَ كَانَ اَبُوْكَ يَصْنَعُ، قَالَ كَانَ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ اِذَا صَلَّی الْعَصْرَ فَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ لِحَاجَةٍ حَتّٰی يُصَلِّیَ الصُّبْحَ فَاِذَا صَلَّی الصُّبْحَ وَجَدَ دَابَّتَهٗ عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ فَجَلَسَ عَلَيْهَا وَلَحِقَ بِبَادِيَتِهٖ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ)

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہؐ، میرا گھر جنگل میں ہے، وہیں میں رہتا ہوں اور وہیں اللہ کے فضل سے نماز پڑھتا ہوں۔ آپؐ مجھے ایک رات بتا دیجئے جس میں میں اس مبارک مسجد (مسجد نبوی) میں حاضر ہوا کروں (اور رات یہیں عبادت میں بسر

کیا کروں) حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ تیئیسویں رات کو آجایا کرو ـــــ بعد کے راوی کا قول ہے کہ حضرت عبداللہ بن انیسؓ کے صاحبزادے حمزہ بن عبداللہ سے پوچھا گیا کہ آپ کے والد (اس رات میں جب مسجدِ نبوی میں جایا کرتے تھے تو) کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ (بائیسویں تاریخ کو) نمازِ عصر کے وقت مسجدِ نبوی میں جاتے تھے تو صبح کی نماز پڑھنے تک مسجدِ مبارک سے نہیں نکلتے تھے، سوائے اس کے کہ کوئی خاص حاجت پیش آجاتے۔ پھر جب صبح کی نماز پڑھتے تو مسجد کے باہر ان کی سواری موجود ہوتی اور وہ اس پر بیٹھ کر جنگل واپس آجاتے (ابوداؤد)[۲۲]

اس حدیث میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عبداللہ بن انیسؓ کا تیئیسویں رات کو مسجدِ نبوی میں جانا رمضان ہی میں ہوتا تھا یا غیرِ رمضان میں بھی، کیونکہ رمضان کا لفظ اس حدیث میں نہیں آیا ہے۔ اس میں یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیلۃ القدر ہی کے بارے میں یہ عرض کیا تھا کہ میں لیلۃ القدر آپ کے پاس مسجد میں گزارنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس حدیث سے یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ تیئیس تاریخ لیلۃ القدر کی تاریخ ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس راوی سے یہ حدیث مروی ہے انھوں نے حضرت عبداللہ بن انیسؓ سے اتنی تفصیلات معلوم نہیں کیں اور نہ ان کے صاحبزادے سے پوچھا کہ آیا انھوں نے لیلۃ القدر کی خاطر یہ بات پوچھی تھی اور یہ کہ انھوں نے رمضان کے مہینے کی کوئی تاریخ پوچھی تھی یا یہ کہ حضورؐ نے یہ فرمایا تھا کہ ہر مہینے تیئیس تاریخ کو آکے مسجدِ نبوی میں رہا کرو۔ اس لیے یہ حدیث اس بارے میں صریح نہیں ہے کہ آپ نے یہ لیلۃ القدر کی تاریخ بتائی تھی۔ اگر اس کی وضاحت ہوتی تو اس بات کا تعین ہوجاتا کہ تیئیس تاریخ کی رات لیلۃ القدر ہے۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضورؐ کو پہلے لیلۃ القدر کا علم دیا گیا تھا

۱۳۵۔ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ خَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُخْبِرَنَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ، فَقَالَ خَرَجْتُ لِأُخْبِرَكُمْ بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ فَتَلَاحٰى فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسٰى أَنْ يَكُوْنَ خَيْرًا لَّكُمْ، فَالْتَمِسُوْهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ (رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ)

حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ نبوی سے (یا اپنے خانۂ مبارک سے) نکلے تاکہ ہمیں لیلۃ القدر کی خبر دیں۔ اتنے میں دو مسلمان آپس میں جھگڑنے لگے۔ اس پر آپ نے ہم سے فرمایا کہ میں تو تمھیں لیلۃ القدر کی خبر دینے نکلا تھا مگر فلاں اور فلاں آپس میں جھگڑ پڑے اور اس دوران میں وہ اُٹھالی گئی (یعنی اُس رات کا علم مجھ سے رفع کر لیا گیا) شاید تمھاری بھلائی اسی میں تھی۔ لہٰذا اب تم اسے اکیسویں یا تیئسویں یا پچیسویں رات کو تلاش کرو۔ (بخاری)

اب تک جتنی احادیث گزری ہیں ان سب پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کوئی خاص حکمت اور مصلحت ہے کہ اُس نے لیلۃ القدر حتمی طور پر حضورؐ کو نہیں بتائی اور آپ کو اس بات پر مامور نہیں کیا کہ آپ لوگوں کو یہ بتائیں کہ فلاں رات لیلۃ القدر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ جو بات بتانے کی اجازت دی گئی وہ یہ

ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہے اور تم طاق راتوں میں اُسے تلاش کرو۔ اس حدیث میں طاق راتوں میں سے بھی تین راتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی ۲۱، ۲۳ اور ۲۵۔ بعض روایات میں اکیس سے انتیس تک کی طاق راتیں ہیں اور بعض روایات میں آخری سات دنوں کی راتیں ہیں۔

احادیث کی روایت کرتے وقت چونکہ یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ کونسی حدیث کس تاریخ کی ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسی حدیث ابتدائی دور کی ہے اور کونسی بعد کے دور کی۔ علمائے اُمت میں جو بات معروف ہے وہ یہی ہے کہ لیلۃ القدر آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں پر فخر کرتا ہے

۱۳۶۔ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْقَدْرِ نَزَلَ جِبْرِيْلُ فِيْ كَبْكَبَةٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ يُصَلُّوْنَ عَلٰى كُلِّ عَبْدٍ قَائِمٍ اَوْ قَاعِدٍ يَّذْكُرُ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ، فَاِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدِهِمْ يَعْنِيْ يَوْمَ فِطْرِهِمْ بَاهٰى بِهِمْ مَلَائِكَتَهٗ فَقَالَ يَا مَلَائِكَتِيْ مَا جَزَاءُ اَجِيْرٍ وَفّٰى عَمَلَهٗ، قَالُوْا رَبَّنَا جَزَاؤُهٗ اَنْ يُّوَفّٰى اَجْرُهٗ، قَالَ مَلَائِكَتِيْ عَبِيْدِيْ وَاِمَائِيْ قَضَوْا فَرِيْضَتِيْ عَلَيْهِمْ ثُمَّ خَرَجُوْا يَعُجُّوْنَ اِلَى الدُّعَاءِ وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكَرَمِيْ وَعُلُوِّيْ وَارْتِفَاعِ مَكَانِيْ لَاُجِيْبَنَّهُمْ فَيَقُوْلُ ارْجِعُوْا قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ وَبَدَّلْتُ سَيِّئَاتِكُمْ حَسَنَاتٍ، قَالَ فَيَرْجِعُوْنَ مَغْفُوْرًا لَّهُمْ۔ (رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ)

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبریل علیہ السلام ملائکہ کے ایک جھرمٹ میں
اُترتے ہیں اور ہر اُس بندے کے لیے دُعا کرتے ہیں جو اسوقت کھڑا ہوا
یا بیٹھا ہوا اللہ عزّوجل کا ذکر کر رہا ہو (یعنی جاگ رہا ہو اور عبادت کر رہا
ہو) پھر جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر
اپنے ملائکہ کے سامنے فخر کرتا ہے اور اُنھیں مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ
اے میرے فرشتو! اُس اجیر (مزدور) کی جزا کیا ہے جس نے اپنے
ذمے کا کام پورا کر دیا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار
اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری اسے پوری پوری دے دی جائے۔
اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ اے میرے ملائکہ! میرے ان بندوں اور بندیوں
نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا جو میں نے ان پر عائد کیا تھا۔ پھر اب یہ گھروں
سے (عید کی نماز ادا کرنے اور) مجھ سے گڑگڑا کر مانگنے کے لیے نکلے
ہیں، اور قسم ہے میری عزت اور میرے جلال کی، اور میرے کرم اور میری بلند مرتبگی
کی، اور میری بلند مقامی کی کہ میں اِنکی دعائیں ضرور قبول کروں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے
بندوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے: جاؤ میں نے تمھیں معاف کر دیا
اور تمھاری برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دیا —— حضورؐ فرماتے ہیں
کہ پھر وہ اس حالت میں پلٹتے ہیں کہ اُنھیں معاف کر دیا جاتا ہے۔ (بیہقی)
اللہ تعالیٰ ہر سال اپنے مومن بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے کیونکہ
اُنھوں نے رمضان میں روزے رکھے اور لیلۃ القدر کی تلاش میں راتوں کو عبادت
کرتے رہے۔ پھر عید کے روز نماز کے لیے نکلے اور اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے
دعائیں مانگیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اس کے ہاں سے مغفرت اور مہربانیاں حاصل
کر کے پلٹے ——

بَابُ الِاعْتِکَافِ

اَلْفَصْلُ الْاَوَّلُ

اعتکاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت

۱۳۷ - عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَعْتَکِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰی تَوَفَّاهُ اللّٰهُ، ثُمَّ اعْتَکَفَ اَزْوَاجُهٗ مِنْ بَعْدِهٖ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات بخشی۔ پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اعتکاف کیا کرتی تھیں۔ (متفق علیہ)

اِعْتِکَاف کہتے ہیں اپنے آپ کو روکے رکھنے، کسی چیز پر قائم رہنے اور اس سے وابستہ رہنے کو شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف اس چیز کا نام ہے کہ آدمی ایک خاص صورت سے مسجد میں ٹھہرا رہے۔ گویا مسجد میں قیام کرنے اور وہاں اپنے آپ کو روکے رکھنے کا نام اعتکاف ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں مسجد میں قیام فرماتے تھے اور آپ کا یہ معمول عمر بھر رہا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد آپ کا وہ معمول ہے جو مدینہ طیبہ میں رہا کیونکہ رمضان کے روزوں کا حکم مدینہ طیبہ میں آیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مکہ میں اس وقت تک سرے سے کوئی مسجد ہی نہیں تھی اور مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) میں اعتکاف کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ اس لیے اس سے مراد یہی ہے کہ قیام

مدینۂ طیبہ میں آخر وقت تک حضورؐ کا یہ معمول رہا کہ آپؐ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

ازواجِ مطہراتؓ کا اعتکاف مسجدِ نبوی میں نہیں بلکہ اپنے حجروں ہی میں ہوتا تھا۔ تمام ازواجِ مطہراتؓ کے حجرے مسجدِ نبوی کے ساتھ ساتھ تھے اور ہر ایک کا دروازہ مسجد کے اندر کھلتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہراتؓ میں سے جس کے ہاں بھی قیام رکھتے تھے وہاں سے آپؐ مسجد کے اندر تشریف لاتے تھے۔ چونکہ یہ حجرے مسجد سے متصل تھے اس لیے ازواجِ مطہراتؓ کو مسجد کے اندر آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ویسے بھی عورتوں کا اعتکاف مسجد میں نہیں ہوتا، بلکہ گھروں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لیے ازواجِ مطہراتؓ بھی رمضان کے آخری عشرے میں اپنے اپنے حجروں میں اعتکاف کرتی رہیں۔

رمضان میں حضورؐ کی بے انتہا فیاضی اور جبریلؑ کے ساتھ دورۂ قرآن

۱۳۸۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجْوَدَ النَّاسِ بِالْخَيْرِ وَكَانَ اَجْوَدَ مَا يَكُوْنُ فِيْ رَمَضَانَ، كَانَ جِبْرِيْلُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِيْ رَمَضَانَ يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنَ فَاِذَا لَقِيَهٗ جِبْرِيْلُ كَانَ اَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيْحِ الْمُرْسَلَةِ۔

(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائی کے معاملے میں (معمولاً) تمام انسانوں سے زیادہ فیاض تھے اور خاص طور پر آپؐ رمضان میں بے انتہا فیاض ہوتے

تھے۔ جبریل علیہ السلام رمضان کے زمانے میں ہر رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور حضورؐ انھیں قرآن مجید سناتے تھے۔ جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے تو حضورؐ بھلائی کے معاملے میں چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ فیاض ہوتے تھے (وہ ہوا جو چلنے کے بعد کہیں رُکتی نہیں اور ہر چیز پر سے گزرتی ہے اور ہر جگہ پہنچتی ہے)۔ (متفق علیہ)

یوں تو قرآن مجید جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا تھا اُسی وقت آپؐ کے دل پر نقش ہو جاتا تھا اور پھر آپؐ کبھی بھولتے نہیں تھے لیکن رمضان کے مہینے میں (کہ جس میں قرآنِ مجید کے نزول کا آغاز ہوا تھا) جبریلؑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور جتنا قرآن اسوقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا وہ سارا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُنھیں سناتے تھے ـــــ پھر جس طرح ہوا ایک دفعہ چل پڑنے کے بعد ہر چیز پر سے گزرتی اور ہر جگہ پہنچتی ہے اس طرح ان دنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر اور فیاضی معمول سے بہت زیادہ عام اور وافر ہو جاتی تھی۔ گویا یہ اس مسرت کی وجہ سے ہوتا تھا جو ہر رات جبریل علیہ السلام سے ملنے اور اُنھیں قرآن سُنانے سے آپؐ کو حاصل ہوتی تھی۔

جبریل علیہ السلام ہر سال رمضان میں حضورؐ کو قرآن سُنایا کرتے تھے

۱۲۹۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَ يُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْقُرْاٰنُ كُلَّ عَامٍ مَرَّةً فَعُرِضَ عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ فِي الْعَامِ الَّذِيْ قُبِضَ وَكَانَ يَعْتَكِفُ كُلَّ عَامٍ عَشْرًا فَاعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ فِي الْعَامِ الَّذِيْ قُبِضَ۔ (رواہ البخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہر سال ایک مرتبہ قرآن مجید پیش کیا جاتا تھا مگر جس سال آپؐ نے انتقال فرمایا اس میں آپ کو دو مرتبہ قرآن مجید سنایا گیا۔ اور آپؐ ہر سال دس دن اعتکاف کیا کرتے تھے مگر جس سال آپؐ کی وفات ہوئی اُس میں آپؐ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔ (بخاریؒ)

گزشتہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کو قرآن مجید سناتے تھے۔ اس حدیث میں ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید سُناتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل دونوں طرح ہوتا تھا۔ یعنی ایک مرتبہ جبریل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے تھے اور ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید جبریل علیہ السلام کو سناتے تھے۔ البتہ جس سال حضورؐ کا انتقال ہوا اس سال آپ کو دو مرتبہ قرآن مجید سنایا گیا۔ یعنی دو مرتبہ قرآن مجید آپ نے سُنایا اور دو مرتبہ جبریل علیہ السلام نے سُنایا۔

حضورؐ کا اعتکاف کرنے کا عام معمول دس دن کا تھا لیکن حیاتِ مبارکہ کے آخری سال آپؐ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔

حضورؐ دورانِ اعتکاف میں ناگزیر ضرورت کے بغیر گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے

۱۴۰۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اعْتَكَفَ أَدْنٰى إِلَيَّ رَأْسَهٗ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَأُرَجِّلُهٗ وَكَانَ يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةِ الْإِنْسَانِ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلّم جب اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے تو مسجد میں بیٹھے بیٹھے
آپؐ اپنا سر مبارک میری طرف (میرے حجرے میں) بڑھا دیا کرتے
تھے اور میں آپ کے بال درست کر دیا کرتی تھی ——— اور آپؐ
(اعتکاف کی حالت میں) گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر کسی خاص
انسانی حاجت کے لیے۔ (متفق علیہ)

حَاجَةُ الْإِنْسَانِ سے مراد وہ ناگزیر حاجت ہے جس کے لیے مسجد سے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ مثلاً پیشاب یا خانہ وغیرہ کیونکہ مسجد میں رفع حاجت نہیں کی جا سکتی۔

باقی رہی یہ بات کہ آپ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر مبارک حضرت عائشہ کی طرف بڑھا دیتے تھے اور وہ آپؐ کے بال درست کر دیتی تھیں تو اس کی صورت یہ تھی (جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے) کہ ازواج مطہراتؓ کے حجروں کا ایک ایک دروازہ مسجد نبویؐ میں کھلتا تھا اسلیے مسجد میں بیٹھے بیٹھے آپ اپنا سر مبارک حضرت عائشہ رضؓ کے حجرے کی طرف بڑھا دیتے تھے اور وہ تیل وغیرہ ڈال کر آپؐ کے بال درست کر دیتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اگر آدمی صرف مسجد کے دروازے سے اپنا سر باہر نکال لے تو وہ اس سے مسجد سے باہر نہیں نکلتا۔ مسجد سے باہر وہ اُسوقت نکلے گا جبکہ وہ قدم باہر نکالے گا لیکن قدم باہر نہ نکالنے کی صورت میں اس کے جسم کا بڑا حصہ مسجد کے اندر رہے گا اس لیے محض سر باہر نکال لینے سے وہ مسجد سے باہر نہیں نکلے گا۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مسجد سے صرف سر باہر نکالنے سے اعتکاف نہیں ٹوٹتا البتہ اگر آپ مسجد سے قدم باہر نکالیں گے تو آپ کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا ——— مسجد سے باہر نکلنے کے لیے اجازت صرف اسی صورت میں ہے جبکہ کوئی ناگزیر حاجت درپیش ہو۔ مثلاً ایک آدمی کا کھانا لا کے دینے والا کوئی نہیں ہے، چنانچہ وہ محض

اپنا کھانا لینے کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے، خواہ گھر جائے یا کسی دکان پر۔
اسی طرح وہ پیشاب پاخانے کے لیے مسجد سے باہر جا سکتا ہے۔ البتہ ناگزیر حاجات
کے سوا کسی حالت میں اعتکاف کرنے والے کو مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔

جاہلیّت میں مانی ہوئی کسی نیک کام کی نذر پوری کرنی چاہیئے

۱۴۱۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ عُمَرَ سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کُنْتُ نَذَرْتُ فِی الْجَاہِلِیَّۃِ اَنْ اَعْتَکِفَ لَیْلَۃً فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، قَالَ فَاَوْفِ بِنَذْرِکَ۔ (مُتَّفَقٌ عَلَیْہِ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ
نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے زمانۂ جاہلیّت میں
یہ نذر مانی تھی کہ میں ایک رات مسجدِ حرام (بیت اللہ) میں اعتکاف
کروں گا (کیا مجھے یہ اپنی نذر پوری کرنی چاہیئے؟)۔ حضورؐ نے
ارشاد فرمایا کہ ہاں تم اپنی نذر پوری کرو۔ (متفق علیہ)

اِس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی انسان نے جاہلیّت میں بھی کسی نیک کام کی
نذر مانی ہو تو اُسے اپنی نذر پوری کرنی چاہیئے۔ ہاں اگر کسی غلط اور بیجا کام کی یا کسی
گناہ کی نذر مانی ہو تو اُسے پورا نہیں کرنا چاہیئے۔ کسی نیک کام کے لیے جاہلیّت
کے زمانے میں مانی ہوئی نذر کے متعلق اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کا پورا کرنا
لازم ہے یا نہیں۔ بعض فقہاء کے نزدیک اُسے پورا کرنا لازم ہے اور بعض
کے نزدیک لازم نہیں ہے، البتہ اس کی اجازت ضرور ہے۔ خود فَاَوْفِ بِنَذْرِکَ
کے بھی دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ تم لازماً یہ نذر پوری کرو۔ اور دوسرا

مفہوم یہ ہے کہ ہاں تم نذر پوری کرسکتے ہو مگر ایسا کرنا ضروری نہیں۔
اِس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جاہلیت کے زمانے میں بھی اعتکاف کا طریقہ معروف تھا اور قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ مشرکین اپنے بتوں کے لیے اعتکاف کیا کرتے تھے اور اہل اللہ اللہ کے لیے عبادت گاہوں میں اعتکاف کرتے تھے۔ بعض اوقات مشرکین بھی مسجدِ حرام میں اللہ کے لیے اعتکاف کرنے کی نذر مانتے تھے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نذر اللہ کی خاطر تھی ورنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اس کے پورا کرنے کا حکم (یا اجازت) نہ دیتے۔

حضورؐ فجر کی نماز پڑھ کر اپنے معتکف میں داخل ہوجاتے تھے

۱۴۲- عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ فِي الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ فَلَمْ يَعْتَكِفْ عَامًا، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اعْتَكَفَ عِشْرِيْنَ۔

(رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَرَوَاهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَابْنُ مَاجَةَ عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں ہمیشہ اعتکاف فرمایا کرتے تھے مگر ایک سال آپؐ نے اعتکاف نہیں فرمایا۔ جب دوسرا سال آیا تو آپؐ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال اپنے زمانہ قیامِ مدینہ میں اعتکاف نہیں کیا جس سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ اعتکاف

کرنا فرض اور واجب نہیں ہے۔ اگر فرض اور واجب ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال بھی اعتکاف نہ چھوڑتے۔ حضورؐ نے یہ مسئلہ واضح کرنے کے لیے کہ یہ فرض و واجب نہیں ہے ایک سال اعتکاف نہیں فرمایا۔ اگرچہ اعتکاف ایک بہت بڑی نیکی ہے اور ایک ایسی سنّت ہے جس پر عمل کیا جانا چاہیئے (اور آپؐ برابر سالہاسال اس پر عمل پیرا رہے) لیکن ایک سال آپؐ نے اعتکاف نہیں فرمایا تاکہ فرض و واجب یا سنّت میں فرق واضح ہو جائے۔ حضورؐ کے اس عمل کی بناء پر فقہاء کے درمیان اعتکاف کی نوعیت میں اختلاف ہوا ہے۔ بعض اس کو واجب قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ہمیشہ اعتکاف کیا ہے۔ اگر ایک سال نہیں کیا تو دوسرے سال آپؐ نے دس دن مزید اعتکاف میں بیٹھ کر اس کی قضا ادا کی۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سنّت ہے اور سنتِ مؤکدہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے اور ایسا مستحب ہے کہ اس پر عمل کیا جانا چاہیئے۔ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو مختلف عمل ہیں فقہاء نے یہ رائیں ان کو دیکھ کر اختیار کی ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ وزن رکھتی ہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّانِي

حضورؐ رمضان کے آخری عشرے میں ہمیشہ اعتکاف فرماتے تھے

۱۴۳۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ فِيْ مُعْتَكَفِهٖ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاؤدَ وَابْنُ مَاجَهْ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تھے تو فجر کی نماز پڑھ کر اپنے معتکف (اعتکاف کی جگہ) میں داخل ہو جاتے تھے۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

مُعتَکَف سے مراد وہ جگہ ہے جو آدمی مسجد میں اپنے اعتکاف کے لیے بنا لے۔ مسجد میں ایک پردہ سا لٹکا کر اپنے لیے خلوت پیدا کرلی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ حضور ص فجر کی نماز پڑھ کر اپنے معتکف میں داخل ہو جاتے تھے۔ امام اوزاعی رح اور امام ثوری رح وغیرہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اعتکاف کی ابتدا فجر کے وقت سے ہوتی ہے۔ بعض دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کی ابتدا مغرب کے وقت سے ہوتی ہے۔ یعنی اگر آدمی ۲۱ تاریخ سے اعتکاف میں بیٹھنا چاہے تو وہ ۲۰ تاریخ کو مغرب کی نماز کے بعد اعتکاف میں بیٹھ جائے گا۔ ائمہ اربعہ اسی بات کے قائل ہیں اور وہ اپنی دلیل دوسری احادیث سے لاتے ہیں۔ لیکن جو فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ اعتکاف کا وقت ۲۰ تاریخ کی فجر سے شروع ہوتا ہے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

حالتِ اعتکاف میں مریض کی عیادت کا مسنون طریقہ

۱۴۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُ الْمَرِيْضَ وَهُوَ مُعْتَكِفٌ فَيَمُرُّ كَمَا هُوَ فَلَا يُعَرِّجُ يَسْأَلُ عَنْهُ. (رواہ ابوداؤد)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں مریض کی عیادت کر لیتے تھے۔ بس آپ سیدھے مریض کے پاس جاتے تھے اور اس کی خیریت پوچھ کر واپس آجاتے تھے۔ (ابوداؤد)

آگے ایک حدیث آتی ہے کہ اعتکاف میں عیادت بھی نہیں کی جا سکتی اور وہ بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی روایت ہے۔ یہاں حضرت عائشہ رض کا بیان

یہ ہے کہ حضورؐ عیادت کے لیے جایا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیادت کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ کسی آدمی کو کوئی معمولی بیماری ہے اور اس سے کوئی خطرے اور پریشانی کی بات نہیں، تو اعتکاف کی حالت میں آپؐ اس کی عیادت کے لیے نہیں جایا کرتے تھے۔ لیکن اگر معلوم ہوتا کہ آدمی بہت سخت بیمار ہے اور اس کی حالت قابلِ تشویش ہے تو اس حالت میں آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے جاتے تھے لیکن اس طرح کہ راستے میں کسی دوسرے کام کے لیے ٹھہرتے اور رُکتے نہیں تھے ——— اس سے دونوں حدیثیں جمع ہو جاتی ہیں اور ان کا ظاہری تضاد رفع ہو جاتا ہے۔

حالتِ اعتکاف میں ممنوع کام، اور اعتکاف کی دو شرطیں

۱۴۵۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتِ السُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَّا يَعُوْدَ مَرِيْضًا وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً وَلَا يَمَسَّ الْمَرْاَةَ وَلَا يُبَاشِرَهَا وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ اِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ وَلَا اعْتِكَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ وَلَا اعْتِكَافَ اِلَّا فِيْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ۔ (رَوَاهُ اَبُوْدَاوُدَ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اعتکاف کرنے والے کے لیے اعتکاف کے معاملے میں سنّت یہ ہے کہ وہ نہ مریض کی عیادت کرے، نہ جنازے میں جائے، نہ عورت کو ہاتھ لگائے اور نہ اس کے ساتھ جسم مَس کرے، نہ کسی حاجت کے لیے مسجد سے نکلے۔ بجز اُس حاجت کے کہ جس کے لیے مسجد سے نکلنے کے سوا چارہ نہ ہو۔ اور کوئی اعتکاف نہیں ہے بغیر روزے کے، اور کوئی اعتکاف نہیں ہے مگر مسجدِ جامع میں۔ (ابوداؤد)

اِس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اعتکاف کے جو احکام بیان کیے ہیں ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ معتکف مریض کی عیادت نہ کرے۔ گزشتہ حدیث اور اس حدیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام حالت میں مریض کی عیادت نہ کرنی چاہیئے لیکن اس صورت میں جبکہ مریض کی حالت تشویش کے قابل ہو عیادت کی جا سکتی ہے۔ معتکف کے لیے دوسرا حکم یہ ہے کہ وہ جنازے کے ساتھ نہ جائے۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ وہ بیوی کے قریب نہ جائے۔ اس سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث گزر چکی ہے کہ وہ حضورؐ کے بال ٹھیک کر دیتی تھیں در آنحالیکہ آپؐ اعتکاف میں ہوتے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تو ہاتھ لگانے کی اجازت دی مگر خود ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ البتہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی دوسرے کا گھر اس طرح مسجد کے ساتھ نہیں ہوتا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس لیے اس معاملے میں حکم وہی رہے گا جو معروف ہے۔

اِس حدیث سے یہ حکم بھی معلوم ہوا کہ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی روزے سے نہ ہو مگر مسجد میں اعتکاف میں بیٹھا ہوا ہو۔

آخری حکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اعتکاف نہیں ہے مگر مسجدِ جامع میں۔ فقہاء کے درمیان اس کے مفہوم میں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ بعض فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اعتکاف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں جمعہ قائم کیا جا رہا ہو، یعنی اس میں جمعہ کی نماز ہوتی ہو۔ اس سے اختلاف کرتے ہوئے فقہاء کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ہر مسجد میں اعتکاف ہو سکتا ہے۔ تاہم مسجدِ جامع کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ وہ مسجد ہے

جس میں جماعت ہوتی ہو۔ یعنی کوئی شخص ایسی ویران مسجد تلاش کرکے وہاں جاکر اعتکاف میں نہ بیٹھ جائے جہاں نمازیوں کی آمد و رفت نہ ہو کیونکہ اس صورت میں وہ اکیلا ہی نماز پڑھتا رہے گا اور جماعت کی نماز سے محروم رہے گا۔ اعتکاف کی نیکی تو اس نے کی لیکن جماعت کی نماز چھوٹ گئی۔ اس لیے اگر مسجد جامع سے ایسی مسجد مراد لی جائے تو پھر اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ ویران مسجد میں اعتکاف کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔

اَلْفَصْلُ الثَّالِثُ

حضورؐ کے معتکف کی کیفیت

۱۴۶۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا اعْتَكَفَ طُرِحَ لَهٗ فِرَاشُهٗ اَوْ يُوْضَعُ لَهٗ سَرِيْرُهٗ وَرَاءَ اُسْطُوَانَةِ التَّوْبَةِ

(رَوَاهُ ابْنُ مَاجَه)

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کا ارادہ فرماتے تھے تو (مسجدِ نبوی میں) توبہ والے ستون کے ساتھ یا تو آپؐ کے لیے بستر بچھا دیا جاتا تھا یا آپؐ کی چارپائی بچھا دی جاتی تھی۔ (ابن ماجہ)

توبہ والا ستون جس کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے اب تک مسجدِ نبوی میں موجود ہے اس پر اُسْطُوَانَةُ التَّوْبَةِ کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک صحابی حضرت ابو لُبابہ رضی اللہ عنہ سے ایک غلطی سرزد ہوگئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بنی قُرَیظہ کے پاس بطور سفیر کے بھیجا تو انھوں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر اشارۃً انھیں یہ بتا دیا کہ اب تمھیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا

جائے گا۔ یہ چیز گویا ایک فوجی اور جنگی راز دشمنوں پر ظاہر کرنے کے ہم معنی تھی۔ اس پر سخت گرفت کی گئی۔ چنانچہ جب حضرت ابو لبابہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور کہا کہ جب تک میری معافی نہیں ہوگی اُس وقت تک نہ تو میں اپنے آپ کو کھولوں گا اور نہ کچھ کھاؤں پیوں گا۔ وہ اس حالت میں بندھے رہے یہاں تک کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی معافی آئی تو ان کو کھولا گیا۔ اس ستون کو آج تک مسجدِ نبوی میں محفوظ رکھا گیا ہے اور اسی کے قریب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔

معتکف کے حق میں لکھی جانے والی نیکیاں

۱۴۷۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِی الْمُعْتَکِفِ، ھُوَ یَعْتَکِفُ الذُّنُوْبَ وَیُجْرٰی لَہٗ مِنَ الْحَسَنَاتِ کَعَامِلِ الْحَسَنَاتِ کُلِّھَا۔ (رَوَاہُ ابْنُ مَاجَۃَ)

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معتکف (اعتکاف کرنے والا) کے بارے میں فرمایا: اعتکاف کرنے والا چونکہ (اعتکاف کے زمانے میں) گناہوں سے رُکا رہتا ہے اس لیے اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں لکھی جاتی ہیں جو اُس شخص کے حق میں لکھی جاتی ہیں جو تمام نیکیوں پر عمل پیرا ہو۔ (ابن ماجہ)

اعتکاف کرنے والا اعتکاف کی وجہ سے رُکا ہوا تو گناہوں سے ہے

لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کا معاملہ اس کے ساتھ یہ ہے اس کے حق میں وہ تمام نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں جو اس دوران میں وہ مسجد سے باہر ہونے کی صورت میں کرتا ــــ یعنی یہ بات تو نہیں لکھی جاتی کہ اگر وہ مسجد سے باہر رہتا تو یہ بدی کرتا، لیکن یہ لکھا جاتا ہے کہ اگر وہ باہر رہتا تو یہ نیکی کرتا ــــ یہ خلق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا انتہائی فیاضانہ اور مربیانہ معاملہ ہے کہ گناہ تو اُس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ آدمی سے اس کا صدور نہ ہو جائے اور پھر جتنا گناہ صادر ہوتا ہے صرف اسی قدر لکھا جاتا ہے۔ لیکن نیکی کا معاملہ جدا ہے ــــ صرف یہی نہیں کہ بندۂ مومن کے حق میں وہ نیکی لکھی جاتی ہے جو اس سے صادر ہوتی ہے بلکہ وہ نیکی بھی لکھ دی جاتی ہے جسکے متعلق یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اسکا موقع ملنے کی صورت میں وہ اسے انجام دیتا۔ اسی طرح اگر اس کے دل میں نیکی کا ارادہ ہی آیا ہو اور وہ اسے کسی وجہ سے پورا نہ کر سکا ہو تب بھی وہ نیکی اس کے حق میں لکھ دی جاتی ہے (جبکہ محض گناہ کا ارادہ کرنے پر اُس وقت تک کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر عمل نہ کیا جائے) یہ خاص معاملہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے ساتھ کرتا ہے، کیونکہ وہ فیاض ہے جتنا چاہے اپنی طرف سے کسی کو دے ــــ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ نیکی کے بغیر اجر کا مستحق ٹھہرایا جانا عجیب بات ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بادشاہ اپنی خوشی سے دیتا ہے تو اس پر کسی کے اعتراض کرنے کی کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے۔